الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

برے سلوک کا بہترین جواب اچھا سلوک ہے
جہالت کا بہترین حل اس کو نظر انداز کر دینا ہے

مارچ ۱۹۸۶
شمارہ ۱۱۲

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-
تذکیر القرآن جلد اول	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	5/-
عقلیاتِ اسلام	3/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارفِ اسلام	3/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-
راہیں بند نہیں	3/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	3/-
سبق آموز واقعات	3/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	3/-
پیغمبر اسلام	2/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	3/-
اسلامی دعوت	3/-
خدا اور انسان	3/-
حل یہاں ہے	3/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	3/-
حیاتِ طیبہ	3/-
باغِ جنت	3/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقل کا فیصلہ	
کاروان اسلام	
رازِ حیات	

The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۲ مارچ ۱۹۸۶

فہرست

تاریخ کا فیصلہ	صفحہ ۲	عاجز انسان	صفحہ ۱۷
حقیقی حل	۳	دماغ ایک نشانی	۱۸
تاریخ پکارتی ہے	۴	یہ اسلام نہیں	۱۹
آغاز و انجام	۷	یہودی کردار	۲۰
عجیب محرومی	۸	دانش مندی	۲۱
تعصب	۹	اخلاق کا معیار	۲۴
تنظیم کے بغیر	۱۰	یہ انسان	۲۵
بے صبری کا نتیجہ	۱۱	ایک سفر	۲۷
صبر ایک مثبت عمل	۱۲	آہ یہ لوگ	۴۵
تاریخ ساز کردار	۱۳	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۶
دور سے کنٹرول	۱۵	ایجنسی الرسالہ	۴۸

تاریخ کا فیصلہ

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ۱۶ھ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس موقع پر عیسائیوں کی فرمائش پر خود حضرت عمر مدینہ سے فلسطین گئے تاکہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل کریں۔ اس سلسلے میں جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے :

حان وقت الصلوٰۃ وھو جالس فی صحن کنیسۃ القیامۃ۔ فالتفت الی البطریرك وقال لہ این اُصلّی۔ فقال مکانك صلِّ۔ فقال ما کان لِعُمَر ان یصلّی فی الکنیسۃ فیاتی المسلمون من بعدی ویقولون ھٰنا صلّی عمر ویبنون علیہ مسجدا۔ وابتعد عنھا رمیۃ حجر وفرش عباءتہ وصلّی۔ وجاء المسلمون من بعدہ وبنوا علیٰ مصلاہ مسجدا وھو قائم علیٰ رمیۃ حجر من کنیسۃ القیامۃ الیٰ یومنا ھذا

عبداللہ التل، خطر الیہودیۃ العالمیۃ علی الاسلام والمسیحیۃ، دار القلم، القاھرہ، ۱۹۶۴ صفحہ ۱۲۹

حضرت عمر یروشلم میں کنیسۂ قیامہ کے صحن میں بیٹھے تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ وہ بطریق کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ میں نماز کہاں پڑھوں بطریق نے کہا اپنی جگہ پر پڑھ لیجئے۔ حضرت عمر نے کہا کہ عمر کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ گرجا کے اندر نماز پڑھے۔ پھر مسلمان میرے بعد آئیں اور کہیں کہ یہاں عمر نے نماز پڑھی تھی اور اس پر مسجد بنائیں۔ حضرت عمر وہاں سے ایک پتھر پھینکنے کی مسافت کے بقدر دور گئے اور وہاں اپنی عبا بچھائی اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد مسلمان آئے اور ان کے نماز پڑھنے کی جگہ پر مسجد بنائی۔ یہ مسجد آج بھی کنیسۂ قیامہ سے ایک پتھر پھینکنے کی دوری پر موجود ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلام کی عظیم تاریخ بنائی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نزاع کے مقام سے ہٹ کر اپنی مسجد بناتے تھے۔ ان کے بعد ایسے لوگ آئے جنھوں نے اصرار کیا کہ وہ جھگڑے کی جگہ پر نماز پڑھیں گے اور نزاع کے مقام پر اپنی مسجد بنائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے قلعہ میں ایک اینٹ کا بھی اضافہ نہ کر سکے۔ بلکہ اسلام کا جو قلعہ بن کر کھڑا ہو چکا تھا اس کو بھی انھوں نے اپنی نادانی سے ڈھا دیا۔

حقیقی حل

ایک فارسی شاعر نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے دوست سے سو بار جنگ کی اور سو بار صلح کی۔ مگر اس کو ہماری جنگ و صلح کی خبر بھی نہ ہو سکی۔ کیوں کہ یہ سب ہم خود ہی خود اپنے اندر کرتے رہے :

صد بار جنگ کردہ بہ او صلح کردہ ایم او را خبر نہ بودہ ز صلح و ز جنگ ما

یہ بات بظاہر شاعری کی دنیا کی ہے مگر یہ حقیقت کی دنیا کے لیے بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے جس صلاحیت کے افراد درکار ہوتے ہیں وہ بھی عین وہی صلاحیت ہے جس کا ذکر اس شعر میں کیا گیا ہے۔ یعنی اپنے اندر پیدا ہونے والی شکایت کو خود ہی اپنے اندر اندر ختم کر لینا۔

کوئی بڑا مقصد کوئی شخص تنہا حاصل نہیں کر سکتا۔ ہر بڑے مقصد کے لیے بہت سے آدمیوں کی متحدہ کوشش ضروری ہوتی ہے۔ مگر متحدہ کوشش ہمیشہ ایک مسئلہ بھی پیدا کرتی ہے۔ اور وہ ہے افراد کا باہمی اختلاف۔

جب بھی بہت سے لوگ مل کر کوشش کریں تو لازماً ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں اور تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی تقسیم میں کسی کو کم ملتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کسی کو باعتبار عہدہ اونچی جگہ ملتی ہے اور کسی کو نیچی۔ کسی کی کوئی بات دوسرے کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ کسی کا کوئی عمل دوسرے کو اپنے مفاد کے خلاف نظر آتا ہے۔ غرض بار بار ایک دوسرے کے درمیان ایسی باتیں ہوتی ہیں جو آپس کی تلخی پیدا کریں۔ جو ایک کو دوسرے کے خلاف غصہ، حسد، انتقام اور عداوت میں مبتلا کر دیں۔

ایسے موقع پر قابل عمل حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر آدمی ایک خود اصلاحی مشین (Self-correcting machine) بن جائے۔ وہ اپنے اندر پیدا ہونے والے ہیجان کو خود ہی ٹھنڈا کرلے۔ وہ اپنی شکایت کو خود ہی اپنے اندر رفع کرلے۔

خلیفہ دوم عمر فاروق رضؓ نے جب خالد بن ولیدؓ کو سپہ سالاری کے عہدہ سے معزول کیا تو فوری طور پر حضرت خالد کے دل میں شدید ردعمل پیدا ہوا مگر پھر اسی لمحہ انھوں نے یہ کہہ اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ تم جو کچھ کر رہے تھے خدا سے انعام پانے کی امید میں کر رہے تھے۔ پھر تم کو عمر سے خفا ہونے کی کیا ضرورت۔ انھوں نے حضرت عمر سے شکایت کرنے کے بجائے اپنی اصلاح آپ کر لی۔

تاریخ پکارتی ہے

مغل بادشاہ اورنگ زیب (۱۶۱۸ - ۱۷۰۷) کے آخر عمر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھ سے بے اختیار آنسو جاری ہوگیے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پاس ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا۔ عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر دکن تک لہرا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان آپ کے دل میں باقی ہے جس کے لیے آپ رو رہے ہیں۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر چپ رہے اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا:

سعد اللہ، مردے خواہم سعد اللہ میں ایک مرد چاہتا ہوں۔

اورنگ زیب کے سامنے وہ کون سا مسئلہ تھا جس نے انھیں گھلا رکھا تھا۔ اور وہ ایک مرد کو حاصل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ ان کو نظر آرہا تھا کہ ان کے بعد جو لوگ عظیم مغل سلطنت کے وارث بننے والے ہیں وہ سب خود غرض لوگ ہیں۔ وہ اونچی سطح سے معاملات کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اورنگ زیب کے بعد ذاتی اقتدار کے لیے آپس میں لڑیں گے اور عظیم مغل سلطنت کو تباہ کرکے رکھ دیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ نصف صدی تک حکومت کرنے کے بعد ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ اس وقت اورنگ زیب کے تین لڑکے تھے جن کا نام معظم، اعظم اور کام بخش تھا۔ اورنگ زیب کے آخر وقت میں شہزادہ معظم کابل کا گورنر تھا۔ شہزادہ اعظم گجرات کا گورنر تھا اور شہزادہ کام بخش بیجاپور کا گورنر تھا۔ اورنگ زیب نے مسئلہ کا آخری قابل عمل حل یہ نکالا کہ اس نے ایک وصیت چھوڑی۔ اس وصیت کے مطابق اس نے مغل سلطنت کو تین حصوں میں تقسیم کرکے تینوں لڑکوں کو دیدیا تاکہ اس کے لڑکے اپنے اپنے دائرہ میں رہیں اور آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہ کریں۔

مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا۔ اورنگ زیب کے مرتے ہی تینوں شہزادے دہلی کے تخت کے دعویدار بن کر کھڑے ہوگیے۔ تقریباً دو سال تک آپس میں لڑائیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش اس میں مارے گیے۔ شہزادہ معظم اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کرکے ۱۷۰۸ء میں دہلی کے تخت پر

بیٹھا اور اپنے لیے شاہِ عالم کا لقب اختیار کیا۔

مگر شاہ عالم کو یہ معلوم نہ تھا کہ موت اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ دہلی کے تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی اس کو چار سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۷۱۲ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے چار لڑکے چھوڑے جن کے نام یہ تھے: جہاں دار شاہ، عظیم الشان، جہاں شاہ، رفیع الشان۔ ان لڑکوں کے سامنے اپنے باپ کا اسوہ تھا۔ چنانچہ چاروں لڑکوں میں دوبارہ جانشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ بالآخران میں سے تین لڑکے قتل ہو گیے اور جہاں دار شاہ تخت پر بیٹھا۔ مگر اس کو ایک سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے مقتول بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کے دل میں اپنے باپ کے لیے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ آخر کار اس نے سازش کر کے جہاں دار شاہ پر قابو پا لیا۔ اس نے جہاں دار شاہ کو تخت سے اتار کر لال قلعہ میں اس کو سولی دے دی۔ یہ ۱۷۱۳ء کا واقعہ ہے۔

فرخ سیر نے اگرچہ اپنے چچا کو مار کر دہلی کا تخت حاصل کر لیا مگر وہ خود بھی صرف چھ سال دہلی کے تخت پر بیٹھ سکا۔ لال قلعہ کے اندر جلد ہی اس کے مخالفین پیدا ہو گیے۔ بالآخر ۱۷۱۹ء میں یہ واقعہ ہوا کہ ایک روز بھرے دربار میں لوگوں نے فرخ سیر کو تخت سے گھسیٹ کر نیچے اتار لیا۔ اس کے بعد اسے مار مار کر جیل کے اندر ڈھکیل دیا گیا۔ وہ جیل کے اندر ہی رہا یہاں تک کہ گلا گھونٹ کر اسے مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد شہزادہ رفیع الدرجات دہلی کے تخت پر بیٹھا مگر اس کی مدت حکومت اور بھی کم ثابت ہوئی۔ وہ ۲۸ فروری ۱۷۱۹ء کو تخت پر بیٹھا اور ۴ جون ۱۷۱۹ء کو تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے چند ہی روز بعد وہ مر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تپ دق کا مریض تھا۔

مغل شہزادوں کی آپس کی جنگ نے دہلی کی مرکزی حکومت کو بالکل کمزور کر دیا۔ صوبوں پر مرکز کی مضبوط گرفت باقی نہ رہی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں آزادی اور خود مختاری کا ذہن پیدا ہو گیا۔ صوبوں کے حاکم دہلی کے برائے نام بادشاہ سے آزاد ہو کر اپنی خود مختار حکومتیں قائم کرنے لگے:

> On the decline of the central authority at Delhi, the inevitable centrifugal tendency was manifest in different parts of the Empire, and the provincial viceroys made themselves independent of the titular Delhi Emperor.
>
> *An Advanced History of India*, (1978) p. 529

چنانچہ دکن کا صوبہ ۱۷۲۴ء میں میر قمر الدین خاں (نظام الملک) کے تحت آزاد ہوگیا۔ صوبہ اودھ میں سعادت خاں نے ۱۷۵۴ء میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ صوبہ بنگال میں سرفراز خاں نے ۱۷۳۹ء میں آزاد ہوکر نواب بنگال کا لقب اختیار کر لیا۔ اسی طرح راجپوت ریاستوں (اودے پور، جودھ پور، جے پور، وغیرہ) نے دہلی کی سیاسی وفاداری ترک کرکے آزاد حیثیت حاصل کرلی۔ اورنگ زیب عالم گیر نے جو عظیم سلطنت بنائی تھی وہ اس کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت بظاہر ڈیڑھ سو سال تک باقی رہی۔ مگر یہ ڈیڑھ سو سال صرف باہمی قتل وخون کے سال تھے۔ مغل شاہزادے اور امرار اور وزرار ذاتی اقتدار کے لیے مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اور مغل سلطنت دن بدن کمزور اور منتشر ہوتی چلی گئی۔ انگریز اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک میں دخیل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے انھوں نے پورے ملک پر قبضہ کرلیا۔ لال قلعہ میں بظاہر مغل تاج دار موجود تھا۔ مگر عملاً سارا اقتدار انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ کہا جانے لگا کہ :

حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم۔

اور یہ کہ تخت بہادر شاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا۔

آخر کار ۱۸۵۷ کا انقلاب برپا ہوا اور یہ نام کی مغل سلطنت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

مغل سلطنت کی یہ کہانی تمام مسلمانوں کی کہانی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کی ایک تصویر اوپر کی مثال میں نظر آتی ہے۔ بعد کے دور میں مسلمانوں کا حال یہ رہا کہ جس شخص کو بھی کوئی موقع ملا وہ ذاتی بڑائی قائم کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔ وہ ملے ہوئے مواقع کو اجتماعی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد میں استعمال کرنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر چھوٹی چھوٹی بڑائیاں تو قائم ہوئیں۔ مگر ملت کی عظیم تر بڑائی قائم نہ ہو سکی۔

ایک فرد جب اپنے آپ کو چھوٹا کرنے پر راضی ہوتا ہے اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ پورے مجموعہ کی بڑائی قائم ہو۔ فرد کی قربانی ہی مجموعہ کی بڑائی کی اصل قیمت ہے۔ جس قوم کے افراد کا یہ حال ہو کہ ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو بڑا بنانے کے لیے دوڑے، ایسی قوم کبھی عظمت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہو سکتا ہے۔

آغاز و انجام

۲۸ جنوری ۱۹۸۶ کو امریکہ میں ایک عجیب حادثہ ہوا۔ ایک خلائی سواری (Space shuttle) ایک بلین ڈالر سے زیادہ رقم خرچ کر کے تیار کی گئی۔ اس کا نام چیلنجر (Challenger) تھا۔ وہ ایک خاص اسٹیشن سے ۲۸ جنوری کو خلا کی طرف اڑائی گئی۔ مگر داغے جانے کے صرف ایک منٹ بعد دھماکہ ہوا اور سواری جل کر راکھ ہوگئی۔ اس کے سات مسافر بیک وقت مر گیے۔ کوئی مشینی یا انسانی چیز باقی نہ رہی جو حادثہ کی تفصیلات سے بعد والوں کو باخبر کر سکے۔

پہلی بار انسان ۱۹۵۷ میں خلا میں گیا تھا۔ موجودہ چیلنجر اپنی قسم کی ۲۵ ویں خلائی سواری تھی۔ یہ پورا واقعہ ٹیلی وژن پر دکھایا جا رہا تھا، چنانچہ کروروں لوگوں نے چیلنجر کو زمین سے اوپر جاتے اور اچانک اس کو برباد ہوتے ہوئے دیکھا۔ سات مسافر جو اس حادثہ میں ہلاک ہوئے ان کو اخبارات نے خلائی ہیرو (Space heroes) کا لقب دیا ہے۔

ان مسافروں میں ایک خاتون ٹیچر کرسٹا میک آلف (Christa McAuliffe) بھی تھیں۔ ۳۷ سالہ کرسٹا میک آلف نے سفر سے پہلے ۲۲ جولائی ۱۹۸۵ کو ایجوکیشنل نیوز سروس کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ خلائی سفر میں غالباً میں اپنے آپ کو نیویارک کی سڑکوں پر چلنے سے زیادہ محفوظ پاؤں گی:

I feel, probably, safer going into space than driving around the New York streets.

The Times of India (New Delhi) January 30, 1986

ہمارے دیہات کا ایک آدمی دہلی کے باشندوں پر رشک کرتا ہے۔ جو شخص دہلی میں ہے وہ نیویارک میں رہنے والے آدمی پر رشک کرتا ہے۔ اور نیویارک میں رہنے والے کا حال یہ ہے کہ وہ نیویارک میں مطمئن نہیں۔ وہ امید کرتا ہے کہ وہ خلا میں زیادہ محفوظ سفر کرنے کے قابل ہوگا۔ مگر جب وہ زمین سے نکل کر خلا کی طرف روانہ ہوتا ہے تو سفر شروع ہونے پر ابھی ایک منٹ گزرتا ہے کہ اس کی پوری سواری جل کر بھسم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی تمام امیدوں اور حوصلوں کے ساتھ راکھ بن کر فضا میں منتشر ہو جاتا ہے۔ کیسا عجیب ہے انسان کا آغاز اور کیسا عجیب ہے انسان کا انجام۔

عجیب محرومی

واتل علیهم نبأ الذی اٰتینٰه اٰیاتنا فانسلخ منها فاتبعه الشیطان فکان من الغاوین۔ ولو شئنا لرفعنٰه بها ولٰکنه اخلد الی الارض واتبع هواه

(الاعراف ۷۶-۱۷۵)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی نشانیاں دیں، پھر وہ ان سے نکل بھاگا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا۔ پس وہ گمراہ لوگوں میں سے ہوگیا۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان نشانیوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے۔ مگر وہ دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کرنے لگا۔

ہدایت کے راستہ پر چلنا برتر مقصد پر چلنا ہے۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگ پست مقاصد میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ اس سے اٹھ کر برتر مقصد کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ وہ وقتی فائدہ کی خاطر ابدی فائدے کو کھو دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو ایک نئی تاریخ بنانا مطلوب تھا۔ آپ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ شرک کے دور کو ختم کیا جائے اور توحید کو ہمیشہ کے لیے ایک غالب فکر بنا دیا جائے۔ اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لیے بلاشبہ قربانی درکار تھی۔ قربانی کا یہ سوال بہت سے لوگوں کے لیے اس کا ساتھ دینے میں رکاوٹ بن گیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ابتداءً اس میں شامل ہوئے مگر بعد کو جب ان کے سامنے وہ وقت آیا کہ وہ اپنی خواہشوں کے تقاضے کو ذبح کریں اور اپنی انا کے بت کو توڑ کر اس کا ساتھ دیں تو وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ اپنی ذات کو بچانے کی خاطر خدا کے دین سے دور ہوگیے۔ یہی صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئی اور یہی صورت ہر زمانہ میں پیش آتی ہے۔

کیسا عجیب ہے انسان۔ خدا اس کے سامنے واضح دلائل لے آتا ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ خدا اس کے لیے بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ کھولتا ہے مگر اس کے محدود مفادات اس کو آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ خدا اس کو تاریخ ساز بنانا چاہتا ہے مگر وہ خود ساز بن کر رہ جاتا ہے۔

تعصب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مکہ سے مدینہ آئے۔ اس وقت مدینہ میں کچھ یہود آباد تھے۔ ان کے ایک عالم عبد اللہ بن سلام آپ سے ملے اور کچھ خاص سوالات کیے۔ عبد اللہ بن سلام پر کھل گیا کہ آپ واقعی خدا کے رسول ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا۔

اس کے بعد یہودی قبیلہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ان کو ابھی معلوم نہ تھا کہ عبد اللہ بن سلام نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ عبد اللہ بن سلام تمہارے درمیان کیسے آدمی ہیں (فأیُّ رجل فیکم عبد اللہ بن سلام) اس کے جواب میں انھوں نے کہا: ذالك سیدنا وابن سیدنا واعلمنا وابن اعلمنا (وہ ہمارے سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں۔ وہ ہمارے بڑے عالم ہیں اور ہمارے بڑے عالم کے بیٹے ہیں)

پھر پوچھا گیا کہ تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہوگا اگر وہ اسلام قبول کرلیں۔ انھوں نے کہا خدا کی پناہ، وہ کبھی ایسا نہیں کرسکتے۔ اس وقت عبد اللہ بن سلام اندر موجود تھے۔ وہ نکل کر باہر آئے اور یہود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم لوگ اللہ سے ڈرو۔ خدا کی قسم یہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ حق لے کر آئے ہیں۔ میں ان پر ایمان لایا ہوں تم بھی ان پر ایمان لاؤ۔ یہ سن کر فوراً یہود کا لہجہ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو (کذبت) ایک روایت کے مطابق انھوں نے عبد اللہ بن سلام کے بارہ میں کہا کہ تم نہایت برے ہو اور برے کے بیٹے ہو اور انھوں نے ان کی تحقیر کی (قالوا شرّنا وابن شرّنا وتنقصوہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے یہود نے عبد اللہ بن سلام کے بارہ میں کہا کہ وہ ہمارے بہترین شخص ہیں اور بہترین شخص کے بیٹے ہیں۔ وہ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے سردار کے بیٹے ہیں۔ (فجاءت الیہود فقال ای رجل عبد اللہ فیکم۔ فقالوا خیرنا وابن خیرنا وسیدنا وابن سیدنا) مگر جب عبد اللہ بن سلام نے آکر ان کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو انھوں نے کہا کہ وہ نہایت برے شخص ہیں اور برے شخص کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ان کو ذلیل وحقیر کردیا (قالوا شرّنا وابن شرّنا واتنقصوہ) سیرت ابن کثیر جلد ثانی، صفحہ ۹۶-۲۹۵

تعصب کی یہ قسم آج بھی اتنے ہی بڑے پیمانہ پر پائی جاتی ہے جس طرح وہ قدیم زمانہ میں تھی۔

تنظیم کے بغیر

سینٹ برنارڈ صلیبی دور کا مسیحی پادری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے صلیبی جنگوں کے زمانہ میں یورپ کی مسیحی سلطنتوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارا۔ مگر دو سو سال کی لمبی کوشش کے باوجود مسیحی اقوام کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مکمل شکست ہوئی۔

برٹرینڈ رسل نے اس سلسلہ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ سینٹ برنارڈ نے صلیبی جنگ کی تبلیغ کی۔ مگر بظاہر وہ اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا کہ جنگ لازمی طور پر تنظیم چاہتی ہے۔ جنگ صرف مذہبی جوش کے تحت نہیں لڑی جا سکتی :

> Although he preached the Crusade, he did not seem to understand that a war requires organisation, and cannot be conducted by religious enthusiasm alone.
>
> *A History of Western Philosophy*, p. 431

یہ بات جو برٹرینڈ رسل نے صلیبی دور کے مسیحیوں کے بارہ میں لکھی ہے۔ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی عین درست ہے۔ یہاں مسلمانوں کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ صادق آرہے ہیں کہ تم پچھلی امتوں کے اسوہ پر چلوگے۔ حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی اس کے اندر جا گھسوگے۔

مسیحی اقوام نے قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ یہ جنگ محض مذہبی جوش کے تحت تھی۔ اس میں تنظیم شامل نہ تھی۔ چنانچہ انھیں کامل شکست ہوئی۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی غالب اقوام کے خلاف بے شمار جنگیں کیں۔ مگر یہ تمام جنگیں تنظیم کی ضروری شرط سے خالی تھیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ مسلمانوں کو ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ کیسی عجیب مشابہت ہے قدیم اہل کتاب میں اور جدید اہل کتاب میں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کے پاس صرف جھوٹا جوش باقی رہتا ہے۔ وہ ہوش اس سے رخصت ہو جاتا ہے جو آدمی کے اندر سنجیدگی، حقیقت پسندی اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس سے وہی کردار ظاہر ہوتا ہے جس کا نمونہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں مسیحی اقوام نے پیش کیا اور موجودہ زمانہ میں جس کا مظاہرہ مسلمان ساری دنیا میں کر رہے ہیں۔

بے صبری کا نتیجہ

۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کا واقعہ ہے۔ انڈین ایر لائنز کا ایک جہاز (فلائٹ نمبر ۴۰۶) بمبئی سے دہلی کے لیے اڑا۔ مگر صرف پندرہ منٹ بعد وہ واپس ہوا اور دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہ جہاز کسی ٹکنکل سبب سے آدھ گھنٹہ لیٹ ہو گیا تھا۔ جہاز جب اوپر فضا میں پہونچا تو اس کے ایک مسافر نے کیپٹن بھٹناگر کے نام ایک نوٹ بھیجا کہ وہ بتائے کہ جہاز کیوں آدھ گھنٹہ لیٹ روانہ ہوا ہے۔

کیپٹن نے مذکورہ مسافر کو کاک پٹ میں بلایا اور وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ لیٹ ہونے کی وجہ کیا تھی۔ مسافر اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا اور کیپٹن کی پیٹھ پر گھونسہ مار کر کہا کہ میں نے تمہارے جیسے بہت پائلٹ دیکھے ہیں :

I have seen many pilots like you.

کیپٹن بھٹناگر اس صورت حال سے گھبرا اٹھے۔ انھوں نے فوراً جہاز کو موڑ دیا اور اس کو واپس لاکر دوبارہ بمبئی کے ہوائی اڈہ پر اتار دیا۔ اس کے بعد بمبئی کے ہوائی اڈہ پر کافی دیر تک ہنگامہ رہا۔ بالآخر انڈین ایر لائنز کے ذمہ داروں نے جہاز کو دوسرے پائلٹ کے ذریعہ روانہ کیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ جہاز جب بمبئی سے دہلی پہونچا تو وہ تین گھنٹہ لیٹ ہو چکا تھا۔ مسافر نے آدھ گھنٹہ کی تاخیر برداشت نہ کی۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ وہ تین گھنٹہ تاخیر کے ساتھ اپنی منزل پر پہونچے۔ مزید یہ کہ انڈین ایر لائنز کے ذمہ داروں نے ایک انکوائری (High-level inquiry) بٹھائی ہے۔ مذکورہ مسافر بالفرض کسی سزا سے بچ جائے تب بھی وہ ایک انجام سے بچ نہیں سکتے۔ اسی چیز کی اور زیادہ قیمت دینا جس کی تھوڑی قیمت دینے پر وہ راضی نہیں ہوئے تھے، یعنی وقت۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کر رہا ہے۔ حالاں کہ وہ اپنے مقصد کو کھو رہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہوں۔ حالاں کہ اس کی تیزی کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل سے کچھ اور دور ہو جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

صبر ایک مثبت عمل

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صبر ایک منفی عمل ہے مگر یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک مثبت عمل ہے بلکہ وہ مثبت عمل کی بنیاد ہے۔ کیوں کہ صبر کے بغیر اس دنیا میں کوئی مثبت عمل نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اطراف عرب کے رئیسوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ آپ کا یہ عمل واضح طور پر ایک مثبت عمل تھا۔ مگر اس مثبت عمل کی قیمت صبر تھی۔ اس سے پہلے آپ کو صبر کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ وہ حالات پیدا ہوں جن میں مذکورہ قسم کا مثبت عمل انجام دیا جا سکے۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ رئیسوں اور بادشاہوں کے نام یہ خطوط صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صلح حدیبیہ سے پہلے بھی ہو سکتا تھا۔ پھر آپ نے اس کو صلح حدیبیہ کے بعد کیوں انجام دیا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے آپ جنگ و قتال کے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ صبح و شام دشمنوں کے حملہ کا خطرہ لگا رہتا تھا اور آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی ساری توجہ دفاعی کاموں میں خرچ ہو رہی تھی۔ ایسے غیر معتدل حالات میں حکمرانوں کے نام دعوتی مہم کا منصوبہ بنانا اور اس کی تعمیل کرنا عملاً سخت دشوار تھا۔

صلح حدیبیہ حقیقۃً مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) تھا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد حالات بالکل معتدل ہو گئے۔ اس کے بعد فوراً آپ نے حکمرانوں کے نام دعوت نامے بھیجنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی تعمیل فرمائی۔ جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر کے بغیر کوئی مثبت عمل ممکن نہیں۔ اگر آپ کو داعی بننا ہے تو مدعو کے ساتھ تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ہوگا۔ اگر آپ کو متواضع اخلاق اختیار کرنا ہے تو اپنے سینہ کو تکبر کا قبرستان بنانا ہوگا۔ اگر آپ کو لوگوں کا خیر خواہ بننا ہے تو اپنے اندر اٹھنے والے حسد کے جذبات کو دبانا ہوگا۔ اگر آپ لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اندر پیدا ہونے والے انتقامی جذبات کو ذبح کرنا ہوگا۔ اور یہ سب وہ چیزیں ہیں جو صبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان کا حصول ممکن نہیں۔

تاریخ ساز کردار

اگر ہر درخت یہ چاہے کہ وہ جہاں ہے وہیں کھڑا رہے تو کبھی زمین پر ریلوے لائن نہیں بچھ سکتی۔ اگر تمام دریا یہ چاہیں کہ ان کے سینہ کے اوپر کوئی پُل نہ بنے تو وہ لمبی شاہ راہیں نہیں بنائی جا سکتیں جن کے اوپر انسانیت کے قافلے ایک طرف سے دوسری طرف سفر کرتے ہیں۔ اگر زمین یہ چاہے کہ اس کے اوپر رولر چلا کر اس کے پست و بلند کو ہموار نہ کیا جائے تو وہ پررونق دنیا تعمیر نہیں کی جا سکتی جس کو شہر کہا جاتا ہے۔

اس دنیا کا یہ اصول ہے کہ یہاں تخریب کے بعد تعمیر وجود میں آتی ہے۔ یہاں مجموعہ کی ترقی اجزار کی قیمت پر ہوتی ہے۔ یہاں کلّی فائدہ کی خاطر انفرادی نقصان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہی اصول فطرت کی دنیا کے لیے ہے اور یہی اصول انسانی دنیا کے لیے۔

دین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہاں بھی انفرادی قربانیوں کی زمین پر دین کا قلعہ بنتا ہے۔ افراد جب پیچھے ہٹنے پر راضی ہوتے ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ دین کے مجموعی قافلہ کو اگلی منزل کی طرف رواں دواں کرنے کے لیے راستہ ملے۔

ایک ہے دیندار بننا، اور ایک ہے تاریخ ساز بننا۔ پہلی شکل انفرادی دین داری کی ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ اجتماعی قوت بن کر دین کی نئی تاریخ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ پہلا کام آسان ہے مگر دوسرا کام بے حد مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ مشکل اور کوئی کام اس دنیا میں نہیں۔

اگر آپ داڑھی رکھ لیں۔ آپ نماز روزہ جیسے دینی فرائض کے پابند بن جائیں تو ایسا کرنے کے بعد بھی آپ اپنی ذاتی مصلحتوں کے خانہ ہی میں رہتے ہیں۔ آپ کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اپنے خول کو توڑ کر اس سے باہر آئیں۔ مگر جب آپ دوسروں کے ساتھ مل کر دین کی ایک تاریخ بنانا چاہیں تو بات بالکل بدل جاتی ہے۔ اب آپ کی ذاتی مصلحتیں دوسروں کی مصلحتوں سے ٹکراتی ہیں۔ آپ کے انفرادی تقاضے اجتماعی تقاضوں سے مجروح ہوتے ہیں۔ یہ ایک بے پناہ آزمائش ہے جس سے عہدہ برآ ہونا بے پناہ صبر کے بغیر ممکن نہیں۔

اس بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں بہت سے لوگ "مقتدی" بننے پر راضی ہوں تاکہ ایک

شخص کو "امام" کے فرائض انجام دینے کا موقع ملے۔ اس عمل میں کچھ لوگ بظاہر کھونے والے بنتے ہیں اور کچھ لوگ بظاہر پانے والے۔ مگر آخرت کے اعلیٰ تر مطلوب کی خاطر اسے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ دنیا میں اس کے بغیر کسی اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنا ممکن نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب وہ قیمتی انسانی گروہ ہیں جنھوں نے دین کی ایک تاریخ بنائی۔ ان کے اس کارنامہ کے بارہ میں دو رائے نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تاریخ کو بنانے کے لیے انھیں اپنے آپ کو ہلاک کر دینا پڑا۔

نبوت کے بیس سال بعد غزوۂ حنین پیش آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بے شمار بربادیوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی مال غنیمت ملا۔ آپ نے اس کو یک طرفہ طور پر قریش کے درمیان تقسیم کر دیا اور انصار کو اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ (ولم یعط الانصار شیئاً، ابن ہشام) اسلام کی فتح میں اہل مکہ (قریش) اور اہل مدینہ (انصار) دونوں کی قربانیاں یکساں طور پر شامل تھیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی مملکت کا خلیفہ مقرر کرنے کا وقت آیا تو اس کو صرف اہل مکہ کا حق قرار دے دیا گیا۔ اور اہل مدینہ کو اس سے کلی طور پر محروم رکھا گیا۔ خلیفۂ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولیدؓ کو عین اس وقت سپہ سالاری سے معزول کر دیا جب کہ وہ شاندار فوجی کارناموں کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا چکے تھے کہ ان کو فاتح شام کے لقب کا پروانہ بھیجا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کی نئی تاریخ اس وقت وجود میں آتی ہے جب کہ کچھ لوگ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو بے تاریخ کرنے پر راضی ہو جائیں۔ انھیں یک طرفہ طور پر محروم کیا جائے اور وہ اس کو برداشت کریں۔ عہدوں کی تقسیم میں انھیں کوئی حصہ نہ ملے پھر بھی ان کا ذہنی سکون برہم نہ ہو۔ بظاہر بلا سبب انھیں معزول کر دیا جائے، اس کے باوجود وہ خوشی خوشی اپنی معزولی کے کاغذات پر دستخط کر دیں۔ وہ موت کے فیصلہ کو اپنے لیے زندگی سمجھیں۔ ان کے سر کا تاج اتار اجائے مگر وہ خوش دلی کے ساتھ اس کا استقبال کریں۔

ایسے ہی لوگ تھے جنھوں نے اسلام کے دور اول میں اسلام کی تاریخ بنائی۔ آج بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے جو دوبارہ اسلام کی تاریخ بنائیں گے، اور ایسے ہی لوگوں کے کیے سے یہ کام ہو سکتا ہے ــــ

وما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقّٰھا الا ذو حظ عظیم (حم السجدہ ۳۵)

دور سے کنٹرول

کیا آپ چاہتے ہیں کہ جب آپ چھٹیوں میں اپنے گھر سے باہر ہوں اس وقت بھی آپ اپنے دروازوں کے پردے کھولیں اور بند کر سکیں۔ یا گھر سے دور رہتے ہوئے بھی آپ اطمینان کر سکیں کہ آپ کے بیرونی دروازہ کا تالہ بند ہے یا نہیں۔ اسی طرح کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گھر واپس پہونچنے سے پہلے اپنے گھر کا ایرکنڈیشنر چلا دیں۔

یہ سب کام آپ کر سکتے ہیں۔ جاپان کے بنائے ہوئے خودکار آلات کو اپنے گھر میں نصب کر کے آپ ٹیلیفون کے ذریعہ یہ سب کر سکتے ہیں جب کہ آپ کا گھر خالی ہو۔

اس مشینی نظام کا نام ٹیلی کنٹرول سسٹم ہے۔ اس نظام کو گھر کی مختلف چیزوں سے وابستہ کیا جا سکتا ہے، بشمول ائرکنڈیشنر، الکٹرک تالے، گیس اور لائٹ۔

گھر کے نئے خودکار سامانوں میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہیں، مثلاً آگ یا چوری کے خلاف برقی آلات کے ذریعہ حفاظت۔ اسی طرح دور سے رابطہ قائم کرنے والا "ذہین" ٹیلیفون اور انٹرکام جو مختلف کمروں کو مربوط کرتا ہے۔

ٹیلی کنٹرول نظام کے ذریعہ آدمی گھر کے برقی سامانوں کو کھول سکتا ہے یا ان کو بند کر سکتا ہے۔ وہ آگ کا پتہ کر سکتا ہے۔ گیس کے نکلنے کو معلوم کر سکتا ہے یا مخصوص آلات کے ذریعہ چوری کا پتہ کر سکتا ہے جو کوڈ کی شکل میں پیغامات بھیجتے ہیں۔

خدا کائنات کو کنٹرول کرتا ہے جب کہ وہ کائنات کے باہر ہے، وہ ایک محدود انسان کی مانند کائنات کے اندر موجود نہیں۔ یہ بات پہلے صرف ایک عقیدہ تھی مگر آج وہ ایک ایسی حقیقت بن گئی ہے جس کو ہم اپنے معلوم واقعات کے ذریعہ نہایت آسانی کے ساتھ قیاس کر سکتے ہیں۔ مذکورہ ٹیلی کنٹرول نظام ایک گھر کی سطح پر اسی واقعہ کا گویا ایک ابتدائی مظاہرہ ہے۔ جس کو خدا نے وسیع تر کائنات کی سطح پر زیادہ کامل انداز میں قائم کر رکھا ہے۔

Telecontrol System to keep a watch

Tokyo, June 26, 1985, 1985 (Kyodo)

Want your curtains to open and close at home while you are on vacation? Or to make sure that the front door is locked? Or to turn on the airconditioner just before you get home?
You can do it all, by telephone, with Japanese made home automation equipment.
"Telecontrol systems" can be hooked up to many appliances, including airconditioners, electric locks, rice cookers and lights.
The new home automation products also include security systems to guard against fire or theft through electronic sensors, multifunction "intelligent" telephones for telecommunications, and intercoms linking rooms.
The telecontrol system allows the user to turn appliances on or off, and to check for fire, gas leaks or theft with special censors that send coded signals through a push-button telephone.

The Hindustan Times (New Delhi) June 27, 1985. p. 17)

Steering by satellite

Nineteenth-century clipper-ship captains looked to the stars to steer their course. Many modern skippers rely on Loran, a land-based navigation system using radio waves. Loran, however, has definite limitations: the system's radio transmitters don't cover most of the Pacific, and accuracy declines at sunset. In the future, many high-tech ships will chart their paths using an advanced navigational method called GPS. The system, developed by the U.S. military, will consist of a global network of 18 satellites. Using a $25,000 receiver and a special antenna, ships can pick up coded radio signals transmitted by the four closest GPS satellites. The timing of the signals indicates the location of the vessel. With such a system, modern sailors may seldom stray off course.

Newsweek, September 16, 1985. P. 5

عاجز انسان

جنرل مانکشا (S.H.F.J. Manekshaw) ہندستان کے پہلے فیلڈ مارشل تھے۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۸۶ میں جنرل کیری اپا (K.M. Cariappa) کو ہندستان کے دوسرے فیلڈ مارشل کا اعزازی خطاب دیا گیا ہے۔ ۳۵ سال پہلے وہ ہندستانی فوج سے ریٹائر ہوئے تھے۔ انھوں نے ہندستانی فوج میں جو خدمات انجام دیں اس کو انگریزی اخبارات نے شاندار فوجی کردار (Illustrious military career) سے تعبیر کیا ہے اور ان کو ملک کے قومی ہیروؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر دہلی میں مختلف فوجی تقریبات ہوئیں جن میں جنرل کیری اپا شریک ہوئے۔ ۱۵ جنوری ۱۹۸۶ کو نئی دہلی کے پریڈ گراونڈ میں وہ ہندستانی فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ فوجی جوان پرعظمت انداز میں ان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران ۸۶ سالہ فیلڈ مارشل کیری اپا سے ایک اخبار نویس نے ان کا تاثر پوچھا۔ ان کا فوری جواب یہ تھا :

I envy them. I am not young to march with them.

مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ میں جوان نہیں کہ ان کے ساتھ مارچ کر سکوں (ٹائمس آف انڈیا ۱۶ جنوری ۱۹۸۶)

کیسا عجیب ہے زندگی کا تجربہ۔ انسان فوجی کارنامے انجام دیتا ہے۔ وہ فتوحات کر کے اپنے آپ کو قومی ہیروؤں کی فہرست میں شامل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کو سب سے بڑا فوجی اعزاز دیا جائے اور اس کو فیلڈ مارشل کے پرعظمت خطاب سے نوازا جائے۔ مگر اس وقت انسان اتنا کمزور ہو چکا ہوتا ہے کہ ملنے والے انعام کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی طاقت اسے حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ان فوجیوں کے قدم بقدم چلنے سے بھی عاجز ہوتا ہے جن کو ساتھ لے کر اس نے کبھی معرکے سر کیے تھے اور قلعے فتح کیے تھے۔

انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کا عجز اس کو حادثہ اور بڑھاپا اور موت کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ آدمی اس سب سے بڑی حقیقت کو سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت جاگتا ہے جب کہ خدا کا آخری فیصلہ ظاہر ہو کر اس کو خدا کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ مگر اس وقت کا جاگنا کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

دماغ ایک نشانی

آدمی کو روزانہ نیند آتی ہے اور وہ سو جاتا ہے۔ اس کو وقت پر بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ عام تجربہ ہے جو ہر انسان کو پیش آتا ہے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک عام تجربہ ہے کہ دماغ کو جب کوئی سخت جھٹکا لگتا ہے تو نیند اور بھوک دونوں اڑ جاتی ہیں۔ اب رات آتی ہے مگر آدمی سو نہیں پاتا۔ کھانے کا وقت آتا ہے مگر اشتہا نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ کھانا کھائے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس پورے معاملہ کا تعلق دماغ سے ہے۔ انسان کا جسم بظاہر اسباب کا ایک نظام ہے۔ مگر یہ نظام دماغ کے حکم کے تحت عمل کرتا ہے۔ دماغ حکم دیتا ہے کہ نیند آئے اس وقت آدمی کو نیند آتی ہے۔ دماغ حکم دیتا ہے کہ بھوک لگے اس وقت آدمی کو بھوک لگتی ہے اور وہ کھانا کھاتا ہے۔ جب دماغ کسی ناگہانی سبب سے منتشر ہو جائے تو وہ اپنے معمول کے احکام نہیں دے پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حالت میں جسم کا نظام معطل ہو جاتا ہے۔ یہ انسانی واقعہ چھوٹی سطح پر زیادہ بڑے واقعہ کا نمونہ ہے۔ یہ خدا کی خدائی کو سمجھنے میں ہماری مدد کر رہا ہے۔

دماغ کا جو تعلق جسم سے ہے، وہی تعلق خدا کا پوری کائنات سے ہے۔ کائنات بظاہر ایک مکمل نظام ہے۔ اس کا ڈھانچہ اسباب و علل کا ایک کارخانہ دکھائی دیتا ہے۔ مگر ان سب کے اوپر ایک برتر دماغ ہے اور وہ خداوندِ عالم کی ذات ہے۔ دنیا کا ہر واقعہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ خدا اس کا حکم دے۔ رات اور دن کا آنا، فصل کا اُگنا، بارش کا برسنا، زندگی اور موت کے واقعات سب کے سب براہِ راست خدا کی طرف سے کنٹرول ہو رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں یہ پورا کا پورا کن فیکون کا نظام ہے۔ خدا جس چیز کو کہتا ہے کہ ہو، وہ ہو جاتی ہے۔ اور خدا جس چیز کے ہونے کا حکم نہیں دیتا وہ نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں کے مادی واقعات معنوی حقیقتوں کی تمثیل بن گئے ہیں۔ دماغ اور جسم کا تعلق خدا اور کائنات کے تعلق کی تمثیل ہے۔ آدمی اگر چاہے تو خود اپنی ذات میں خدا کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو ساری کائنات بھی اس کو معرفت تک پہونچانے کے لیے کافی نہیں۔

یہ اسلام نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں : اس کا خون ، اس کا مال اور اس کی آبرو (کل المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ)

قرآن وحدیث میں اتنی سخت تنبیہ کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کرتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال چھینتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی آبروریزی کرتا ہے۔ یہ کام صرف عام لوگ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اسلام کے علَم بردار بنے ہوئے ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ وہ اسلام سے کم کسی چیز پر راضی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جب کسی کے خلاف ایسا کرنے والے ہوتے ہیں تو وہ یہ کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اس کو اسلام سے خارج ثابت کرتے ہیں —— یہ مرتد ہے ، یہ منافق ہے ، یہ بدنیت ہے ، یہ دشمنوں کا ایجنٹ ہے ، وغیرہ۔ اس قسم کا الزام لگانے کے بعد مسلمان نفسیاتی طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس شخص کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کرنے کا انھیں لائسنس مل گیا۔ اب ان کے لیے جائز ہے کہ ایسے شخص کو بے آبرو کریں۔ وہ اس کی معاش کو تباہ کریں حتی کہ اس کو قتل کر ڈالیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب شیطانی افعال ہیں۔

اسلام میں کسی کو سزا دینے کا مقرر اصول ہے۔ محض الزام بازی پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ مرتد شرعی طور پر صرف وہ شخص ہے جو خود اپنے ارتداد کا اعلان کرے۔ اور ایسے مرتد کی سزا بھی صرف ایک قائم شدہ عدالت دے سکتی ہے نہ کہ عام افراد۔ منافق کے لیے شریعت میں اس قسم کی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کو بھی کوئی سزا نہیں دی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرگیا۔ بدنیتی خالص قانونی معنوں میں کوئی جرم نہیں۔ نیت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے صرف اللہ واقف ہے اور وہی کسی آدمی کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق معاملہ کرسکتا ہے۔ کسی انسان کو ہرگز یہ اختیار نہیں کہ وہ ایک شخص کو بدنیت قرار دے کر اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائی کو اپنے لیے جائز کرلے۔

مسلم معاشرہ میں اس قسم کی باتیں صرف اس لیے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کا ڈر نہیں۔ اگر لوگ اللہ سے ڈریں تو وہ کبھی کسی کے خلاف اس قسم کی کارروائی نہ کریں۔

یہودی کردار

یہودی کردار دراصل اعتراف نہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو کسی بھی مرحلہ میں دوسرے کو تسلیم نہیں کرتا۔ نہ ابتدائی مرحلہ میں اور نہ آخری مرحلہ میں۔ اس کردار کی مثال قرآن میں کتے سے دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ایسا انسان کتے کی مانند ہے کہ اس کو چھوڑ دو تب بھی ہانپے اور باندھے رکھو تب بھی ہانپے۔ یعنی وہ دوسرے کے فضل کا اعتراف نہ اس وقت کرتا جب کہ وہ تصوراتی حیثیت رکھتا تھا اور نہ اس وقت کرتا جب کہ اس کی شخصیت ایک واقعہ بن چکی ہو۔ (اعراف ۱۷۵)

اس کی وضاحت کے لیے سورہ یوسف کی مثال لیجیے۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف جب چھوٹے تھے تو ان کے سوتیلے بھائیوں کو ان سے جلن ہو گئی۔ انھوں نے چاہا کہ انھیں مار ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کو گھر سے دور ایک سنسان مقام پر لے گیے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ بظاہر حضرت یوسف کو اس اندھے کنوئیں میں اپنی موت آپ مرجانا چاہیے تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ وہ اس سے نکل کر مصر پہونچے۔ وہاں دوبارہ آپ کے لیے ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ آپ مصر کی حکومت میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوگیے۔

اس کے بعد دوبارہ وہ اسباب پیدا ہوئے جس نے حضرت یوسف کے بھائیوں کو حضرت یوسف کے دربار میں اس حال میں پہونچایا کہ حضرت یوسف بڑے تھے اور وہ ان کے سامنے چھوٹے بن کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت جب سوتیلے بھائیوں کو معلوم ہوا کہ جس نوجوان کو انھوں نے اندھے کنوئیں میں ڈالا تھا وہ مصر پہونچ کر یہاں کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا : خدا کی قسم، اللہ نے تم کو ہم سے اوپر کر دیا (تاللّٰہ لقد آثرک اللّٰہ علینا) حضرت یوسف کے بھائیوں نے اگرچہ پہلے مرحلہ میں حضرت یوسف کا اعتراف نہیں کیا تھا مگر دوسرے مرحلہ میں وہ ڈھ پڑے اور کھلے دل سے حضرت یوسف کے فضل کا اعتراف کرلیا۔

حضرت یوسف کے بھائی اگر یہودی ذہنیت کے ہوتے تو وہ کتے کی طرح پہلے بھی ہانپتے اور بعد کو بھی ہانپتے۔ یعنی پہلے اگر وہ جلن میں مبتلا ہوئے تھے تو اب وہ کہہ دیتے کہ مصر کے مشرک بادشاہ کی خوشامد کر کے اس نے مصر میں یہ عہدہ حاصل کیا ہے۔ وہ حضرت یوسف کے معاملہ میں پہلے جس طرح بے انصاف بنے ہوئے تھے بعد کو بھی وہ ان کے حق میں بے انصاف ثابت ہوتے۔

دانش مندی

دنیا دانش مندی کا امتحان ہے۔ یہاں ہر آدمی آزمائش کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ جو شخص دانش مندی کا ثبوت دے وہ امتحان میں پورا اترے گا۔ اور جو شخص دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے وہ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ اس کے لیے خدا کی اس دنیا میں ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دانش مندی کیا ہے۔ دانش مندی حقیقۃً کسی آدمی کی اس صلاحیت کا نام ہے کہ وہ غیر معتدل حالات میں معتدل ذہن سے سوچ سکے۔ وہ عملی بحران کے وقت بھی فکری بحران میں مبتلا نہ ہو۔ غیر معتدل حالات ہی میں دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون شخص فی الواقع دانش مند ہے اور کون شخص دانش مند نہیں۔

زندگی کا سب سے نازک امتحان یہ ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے دیکھ سکے۔ اکثر ناکامیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی واقعات کو ان کے صحیح رُخ سے نہیں دیکھتا اس لیے وہ ان کے بارے میں صحیح رائے بھی قائم نہیں کر پاتا۔

مثال کے طور پر اکثر ایک واقعہ کے ساتھ دوسرا واقعہ شامل رہتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی کو جاننا پڑتا ہے کہ کب اسے ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے الگ کر کے دیکھنا ہے اور کب اسے ایسا کرنا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے ملا کر دیکھے۔ زندگی میں کبھی پہلی دانش مندی مطلوب ہوتی ہے اور کبھی دوسری دانش مندی۔ یہاں ہم مسئلہ کی وضاحت کے لیے دونوں قسم کی مثالیں نقل کریں گے۔

دشمن کو رہنما بنانا

قدیم عرب میں موجودہ زمانہ کی طرح راستوں کے نشانات نہیں تھے اور نہ اس وقت آج کل کی طرح سڑکیں پائی جاتی تھیں۔ آدمی مجبور تھا کہ وہ سنسان پہاڑوں اور لق و دق صحراؤں کے درمیان اپنا سفر طے کرے۔ چنانچہ دور کا سفر کرنے کے لیے لوگوں کو رہنما کی ضرورت پڑتی تھی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت

کا فیصلہ فرمایا تو اس وقت آپ کے سامنے یہی مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ آپ دشمن کی نظروں سے بچنے کی خاطر یہ چاہتے تھے کہ معروف راستہ کو چھوڑ کر غیر معروف راستے سے اپنا سفر طے کریں۔ آپ کو ایک ایسے اچھے رہنما کی ضرورت تھی جو آپ کو مطلوب راستے سے چلا کر بحفاظت مدینہ پہونچا دے۔ اس وقت جو صورت پیش آئی اس کا ذکر سیرت ابن ہشام میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

فاستاجرا عبد اللّٰہ بن ارقط رجلاً من بنی الدیل بن بکر، وکانت امہ امرأۃ من بنی سہم ابن عمرو وکان مشرکا یدلّھما علی الطریق۔

(الجزء الثانی، صفحہ ۹۸)

(رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر نے) عبد اللہ بن ارقط سے اجرت پر معاملہ کیا۔ وہ بنو دیل بن بکر کا ایک شخص تھا اور اس کی ماں بنو سہم بن عمرو سے تعلق رکھتی تھی۔ عبد اللہ بن ارقط ایک مشرک تھا۔ وہ راستہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔

عبد اللہ بن ارقط کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ مشرک تھا۔ یعنی وہ رسول اللہ صلعم کے دشمن گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ صحرائی راستوں کا ماہر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقط کے ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا۔ اسی لیے یہ ممکن ہوا کہ آپ اس کو اپنے سفر کا رہنما بنائیں۔ اگر آپ اس کے رہنما ہونے کی حیثیت کو اس کے مشرک ہونے کی حیثیت سے الگ کر کے نہ دیکھتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا کہ آپ ہجرت جیسے نازک سفر میں اس کو اپنے راستہ کا رہنما بنائیں۔

انتقام نہ لینا

دوسری مثال کے ذیل میں ہم ایک غیر مسلم کا واقعہ نقل کریں گے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کا مقابلہ اپنی زندگی سے کرکے دیکھیں کہ کیا وہ دانش مندی کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو کبھی ایک غیر مسلم تک کے یہاں پایا جاتا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے ذیل میں آیا ہے۔ مکی دور میں ایک بار ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صفا کے پاس تھے۔ ابوجہل وہاں سے گزرا۔ ابوجہل نے آپ کو برا بھلا کہا اور آپ کے ساتھ بدزبانی کی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالکل خاموش رہے۔ عبد اللہ بن جدعان

کی ایک خادمہ نے اس پورے واقعہ کو دیکھا۔ وہ واپس ہوئی تو راستہ میں اس کی ملاقات آپ کے چچا حمزہ بن عبد المطلب سے ہوئی جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔

حمزہ اس وقت شکار سے واپس آرہے تھے اور ان کے ہاتھ میں لوہے کی کمان تھی۔ خادمہ نے ان سے کہا کہ اے ابو عمارہ، کاش آپ دیکھتے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کے بھتیجے محمدؐ کے ساتھ ابو الحکم بن ہشام (ابو جہل) نے کیا کیا۔ اس نے آپ کے بھتیجے کو یہاں بیٹھا ہوا دیکھا تو ان کے ساتھ بدزبانی کی اور ان کو سخت برا بھلا کہا۔ حمزہ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ فوراً ابو جہل کی تلاش میں چل پڑے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ کعبہ کے اندر اپنے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تیزی سے اس کے پاس پہونچے اور اپنی کمان اس کے سر پر اتنے زور سے ماری کہ خون بہنے لگا۔

اس کے بعد ابو جہل کے قبیلہ (بنو مخزوم) کے لوگ دوڑے کہ حمزہ کو ماریں۔ مگر ابو جہل نے فوراً انھیں روک دیا۔ اس نے کہا کہ ابو عمارہ (حمزہ) کو چھوڑ دو۔ کیوں کہ خدا کی قسم میں نے ان کے بھتیجے کو بہت زیادہ برا بھلا کہہ دیا تھا (دعوا ابا عمارۃ فانی واللّٰہ قد سببت ابن اخیہ سبًا قبیحًا۔ سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۳)

یہ مثال بتاتی ہے کہ ابو جہل نے دو واقعات کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھا۔ اپنی بدزبانی کو اور حمزہ کے مارنے کو۔ اگر وہ اپنی بدزبانی کو الگ کر دیتا اور صرف حمزہ کے مارنے کو دیکھتا تو وہ بھی غصہ ہو جاتا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر حمزہ کو مارنا شروع کر دیتا۔ مگر جب اس نے حمزہ کے فعل کے ساتھ خود اپنے فعل کو ملا کر دیکھا تو اس کو معاملہ برابر سرابر نظر آیا اس لیے اس نے نہ خود حمزہ کو برا کہا اور نہ اپنے ساتھیوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دی۔

موجودہ دنیا میں حقیقتیں ملی جلی صورت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کو ایک رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ نظر آتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھا جائے تو وہ کچھ بن جاتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو عقل دے کر اسے اس امتحان میں ڈالا ہے کہ وہ اپنی عقل کے استعمال سے صحیح رخ کو جانے۔ وہ واقعات کو ان کے صحیح ترین رُخ سے دیکھ سکے۔ اگر آپ واقعہ کو صحیح رخ سے نہ دیکھیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس معاملہ میں آپ کا رویہ بالکل غلط ہو کر رہ جائے گا۔

اخلاق کا معیار

قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی سے تمہاری دشمنی ہو جائے تو تم ایسا مت کرو کہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو، بلکہ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ کے مطابق ہے (لایجرمنکم شنآن قوم علی ان لاتعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ)

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے: یعنی کسی کا بغض تم کو نہ ابھارے کہ اس کے معاملہ میں تم انصاف کو چھوڑ دو۔ بلکہ ہر ایک کے معاملہ میں انصاف کرو خواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ای لایحملنکم بغض قوم علیٰ ترک العدل فیھم بل استعملوا العدل فی کل احد صدیقاً کان او عدوًا)

اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ موجودہ دنیا میں تقویٰ کا سب سے زیادہ یقینی معیار ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو دونوں بالکل ٹھیک نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اعلیٰ اخلاق پر قائم ہیں۔ مگر کسی کے اخلاق کو جانچنے کا یہ صحیح معیار نہیں۔ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے، اس کا اندازہ معتدل حالات میں نہیں ہوتا۔ اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ دونوں کے درمیان تلخی اور شکایت کی فضا پیدا ہو گئی ہو۔

ایک پھل اندر سے کیسا ہے، اس کا اندازہ آپ پھل کے چھلکے کو دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ اس کا پتہ صرف اس وقت چلتا ہے جب کہ پھل کو توڑا جائے۔ اسی طرح کوئی انسان حقیقۃً کیا ہے، اس کا اندازہ معمول کے حالات میں نہیں ہوتا، بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے۔ جب آدمی کے ساتھ کوئی خلافِ مزاج واقعہ پیش آتا ہے، اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ عام حالات میں آدمی اپنے آپ کو چھپائے رہتا ہے۔ مگر جب اس کی شخصیت کو کوئی شدید جھٹکا لگتا ہے اس وقت اس کا اندر اس کے باہر آجاتا ہے۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ وہ شریف تھا یا غیر شریف۔ وہ بے اخلاق تھا یا با اخلاق۔

جس شخص سے آپ کا بگاڑ نہیں ہوا اس سے خوش اخلاقی برت کر آپ خدا کے نزدیک خوش اخلاق نہیں ہو سکتے۔ خدا کے نزدیک آپ اس وقت خوش اخلاق قرار پائیں گے جب کہ آپ اس شخص کے معاملہ میں خوش اخلاق ثابت ہوں جس سے آپ کا بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

یہ انسان

ایک ہے کسی چیز کو دور سے دیکھنا۔ اور ایک ہے اس کا قریب سے تجربہ کرنا۔ دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ دور سے دیکھنے میں ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے مگر جب قریب سے اس کا تجربہ کیا جائے اسی وقت صحیح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔

دور سے دیکھئے تو ناگ پھنی بھی آپ کو اچھی معلوم ہوگی۔ حتی کہ بہت سے لوگ ناگ پھنی کے پودے کو گملے میں لگا کر اس کو اپنے گھر کی زینت بناتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ناگ پھنی کے پتوں کو رومال اور تولیہ کے طور پر استعمال کریں تو اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ ناگ پھنی حقیقت میں اس سے بالکل مختلف تھی جو وہ دور سے دیکھنے میں نظر آرہی تھی۔

یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے۔ لوگوں سے رسمی طور پر ملئے، میز کرسی کی سطح پر ان سے باتیں کیجئے۔ تو ہر آدمی اچھا نظر آئے گا۔ مگر جب حقیقی تجربہ پیش آتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو وہ دور سے دیکھنے میں نظر آرہا تھا۔ لوگ اپنے الفاظ میں کچھ ہیں اور عمل میں کچھ۔ لوگ رسمی ملاقاتوں میں اچھے نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقی تجربہ فوراً بتا دیتا ہے کہ وہ اتنے برے تھے کہ کوئی جانور بھی اتنا برا نہیں ہوتا۔

آپ جانور کے بارہ میں پیشگی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ اسی وقت ستائے گا جب کہ آپ خود پہلے اس کو ستائیں۔ مگر انسان یک طرفہ اپنے دوسرے بھائی کو ستاتا ہے۔ آپ لوہے کے بارہ میں پیشگی طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ اس کو آپ جہاں بھی استعمال کریں گے وہ ہمیشہ "لوہا" ثابت ہوگا۔ وہ مٹی اور لکڑی نہیں بن جائے گا۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ آپ اس کی باتوں کے فریب میں آکر اس کو لوہا سمجھ لیتے ہیں مگر عملی تجربہ میں وہ مٹی کی طرح کمزور ثابت ہوتا ہے۔

آہ، لوگوں کو معلوم نہیں کہ آخرت میں ان کے ساتھ بہ اعتبار حقیقت معاملہ کیا جائے گا نہ کہ باعتبار ظاہر۔ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو پردہ میں چھپا لیتا ہے مگر آخرت میں اس کے جھوٹے الفاظ اس کو چھپانے والے نہیں بنیں گے۔ آخرت میں آدمی اپنے ظاہر میں بھی ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ اپنے باطن میں تھا۔

May 3, 1985

Maulana Wahiduddin Khan
C-29, Nizamuddin West
New Delhi - 110 013
India

Assembly of the World's Religions

A Project of the International Religious Foundation, Inc.

Dear Mr. Khan

This letter is to invite you to attend an Assembly of the World's Religions, which will occur at the American Great Gorge Conference Center, McAfee, New Jersey (near New York City) on Friday, November 15th to Thursday, November 21st, 1985.

The Assembly of the World's Religions, 1985, is the first in a major series of events in world ecumenism, to be followed in 1989 by a second gathering. These events are to be preparatory meetings for a major Assembly to take place in 1993, in commemoration of the 100th anniversary of the 1893 World's Parliament of Religions that was held in conjunction with the Columbian Exposition in Chicago, Illinois, U.S.A. (see enclosed brochure for more details).

Planning Committee

SYED AUSAF ALI
EWERT H. COUSINS
SAMUEL GAKUHI KIBICHO
URSULA KING
TYLER D. HENDRICKS
BETTY RUBENSTEIN
KRISHNA SIVARAMAN
EMILIE ZUM BRUNN

Advisory Board

WANDE ABIMBOLA
MUKTI ALI
ARABINDO BASU
A.K. BROHI
THOMAS KEATING
FARHANG MEHR
RICHARD QUEBEDEAUX
HARBANS SINGH
HUSTON SMITH
ZWI WERBLOWSKY

Executive Committee

RICHARD J. PAYNE
Program Chairperson

M. DARROL BRYANT
Project Advisor

JOHN T. MANIATIS
Project Director

The Assembly is sponsored by the International Religious Foundation; Inc. (I.R.F.) established by the Unification Church (see last page of enclosed brochure). The Assembly grows organically out of two I.R.F. projects: the annual international conference on "God: The Contemporary Discussion" initiated by New ERA (the New Ecumenical Research Association) and the "Youth Seminar on World Religions".

The theme of the 1985 Assembly is, "The Recovery of our Classical Spiritual Heritage", emphasizing the worldwide phenomena of a return to roots and the retrieval of traditional values. The Assembly seeks, through an integrated program of prayer, meditation, study, dialogue, film, art and ritual, to discern patterns of unity and understanding among the world's religious traditions. It seeks to provide a new environment for global religious exchange in order to foster international harmony, social justice and authentic human development.

This event will bring together approximately 600-700 spiritual teachers, scholars, scientists, lay leaders, artists and youth. The Assembly's program of plenary speakers will feature spiritual leaders from the world's traditions, including Venerable Samdhong Rinpoche, His holiness Swami Chidananda, Professor Wande Abimbola and others. The Assembly will strive to reflect a balanced representation of the religious traditions, genders, cultures and regions of our world. Participants will select membership in one of 12 working themes, which will then be subdivided into smaller groups of 20-25 contributors. The 12 themes of the 1985 Assembly will be:

1. Interreligious Dialogue
2. Family Life and Learning
3. Spiritual Journey and the Formation of Persons
4. Social, Political and Economic Systems
5. Images of God, Woman, and Man
6. Stewardship of Creation and the Fate of the Earth
7. Spiritual Disciplines and Practices
8. Poverty and Human Rights
9. Communication, Language, Symbol and Art
10. Science and Technology
11. The Encounter with Secularity
12. Morality, Ethics and Values

c/o Unification
Theological
Seminary
10 Dock Road
Barrytown
NY 12507
(914) 758-8838/39
Telex: 4991393 NWERA
Cable IRFINC

ایک سفر

نومبر ۱۹۸۵ میں کرۂ ارض کے اس حصہ کا سفر ہوا جس کی بابت خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں کہا تھا:

کولمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

یہ سفر امریکہ کے دو شہروں، نیویارک اور نیوجرسی کے لیے تھا۔ نیویارک کے لیے میرا پہلا سفر اپریل ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسرا سفر موجودہ سفر تھا۔ یہ سفر ایک عالمی مذاہب کانفرنس کے دعوت نامہ پر ہوا۔

مذاہب کی پارلیمنٹ (World's Parliament of Religions) کے نام سے ایک کانفرنس امریکہ کے شہر شکاگو میں ۱۸۹۳ میں ہوئی تھی۔ اس تاریخی کانفرنس کی یاد میں امریکہ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ساری دنیا سے مختلف مذاہب کے نمائندے بلائے گیے۔ اس کانفرنس کا مقصد روحانی اتحاد (Spiritual Unity) اور عالمی امن بتایا گیا تھا اس کو انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن (نیویارک) نے منظم کیا تھا۔ انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن کے ایک ذمہ دار پروفیسر ہیوسٹن اسمتھ (Huston Smith) ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں بھی اس سے پہلے آئے تھے جس کا ذکر الرسالہ مارچ ۱۹۸۵ کے خبرنامہ میں شائع ہو چکا ہے۔

مجھ کو اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ کے طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت نامہ کے مطابق میں اس کانفرنس میں شریک ہوا اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا:

The Concept of Morality in Islam

یہ مقالہ انشاء اللہ الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔ کانفرنس کی طرف سے جو دعوت نامہ موصول ہوا اس میں درج تھا کہ آپ اپنے بچوں میں سے کسی کو لانا چاہیں تو اپنے ساتھ لا سکتے ہیں چنانچہ میرے لڑکے ثانی اثنین بھی میرے ساتھ اس سفر میں شریک تھے۔

اس کانفرنس کا نام اس کے ذمہ داروں نے (Assembly of the World's Religions)

یعنی عالمی مذاہب کی اسمبلی رکھا تھا۔ ہندستان سے اس "اسمبلی" میں کئی درجن افراد شریک ہوئے جو ہندوازم، جین ازم، بدھزم، سکھ ازم وغیرہ مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندستان سے شریک ہونے والے دوسرے مسلمان ڈاکٹر سید اوصاف علی (ڈائرکٹر اسلامک انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد نئی دہلی) تھے۔ وہ اسمبلی کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ اس اعتبار سے غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی کہ اس میں دنیا بھر کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۵ کو ہم دہلی ایرپورٹ میں داخل ہوئے اور اگلے دن ۱۴ نومبر کو آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ ایرپورٹ پر اتنا زیادہ وقت کیسے لگا۔ اس کا سبب ہوائی جہاز کا وقت تھا۔ دہلی سے ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت رات کو بارہ بج کر ۴۵ منٹ پر تھا۔ انگریزی کیلنڈر کے مطابق ۱۲ بجے رات کو ایک تاریخ ختم ہوتی ہے اور ۱۲ بجے رات کے فوراً بعد اگلی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر اگرچہ ہم صرف تھوڑی دیر رہے۔ مگر اسی تھوڑی دیر میں کیلنڈر کی ایک پوری تاریخ بدل چکی تھی ——— زندگی ایک عجیب سفر ہے۔ اس میں کبھی ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک پہونچنے کے لیے "۲۴ گھنٹے" لگ جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک کا سفر صرف چند لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔

ہندستان سے امریکہ کا سفر بہت لمبا سفر ہے۔ ہوائی جہاز سے تقریباً ۲۰ گھنٹے۔ مزید یہ کہ ہوائی حادثات کی تاریخ میں ۱۹۸۵ سب سے زیادہ برا سال رہا ہے۔ اس سال اگست ۱۹۸۵ تک کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۲ ہوائی حادثات ہوئے۔ ان میں مجموعی طور ۱۶۹۸ مسافر ہلاک ہوئے۔ پچھلے ۲۰ سال کے اندر ہوائی حادثات میں مرنے والوں کا اوسط سالانہ ۹۰۰ تھا۔ اس لحاظ سے ۱۹۸۵ کا اوسط تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو اٹلانٹک کے اوپر ایر انڈیا کا حادثہ خاص اسی راستہ میں ہوا تھا جس میں ۳۲۹ آدمی ہلاک ہو گیے۔ اگرچہ عام حادثات میں لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ مگر ہیگ پروٹوکول کے مطابق ہوائی حادثہ میں ہلاک ہونے والے ہر مسافر کے پس ماندگان کو ۲۰ ہزار ڈالر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ان حالات میں جب میں دہلی میں ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۰۴ پر بیٹھا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک پرخطر سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ دل میں تھوڑی دیر کے لیے دہشت کا احساس ہوا۔ پھر مجھے

جان شیڈ (John Shedd) کا قول یاد آیا کہ جہاز بندرگاہ پر محفوظ ہوتا ہے مگر جہاز اس لیے نہیں کہ وہ بندرگاہ پر کھڑا رہے :

A ship in harbour is safe, but that is not what ships are for.

یہ جہاز بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا جہاز ہوتا ہے۔ اس کے اندر آپ ایک سرے پر کھڑے ہوں تو آپ دوسرے سرے کے مسافر کو پہچان نہیں سکتے۔ ایسے ایک جہاز کی قیمت تقریباً پچاس کروڑ روپے ہوتی ہے۔ اس قسم کے جہاز زیادہ تر امریکہ میں بنائے جاتے ہیں۔ جہاز سازی کی صنعت میں امریکہ آج سب سے آگے ہے۔ کسی جہاز پر خواہ ایر انڈیا لکھا ہوا ہو یا ایر پاکستان، سعودی ایر لکھا ہوا ہو یا ایرانی ایر بہر حال وہ امریکی کارخانہ کا بنا ہوا ہوگا۔

ہماری پہلی منزل بمبئی تھی۔ جاتے ہوئے یہ جہاز دہلی، بمبئی۔ لندن۔ نیویارک کے راستے سے جاتا ہے اور واپسی میں نیویارک لندن۔ دہلی واپس آتا ہے۔ ہمارا یہ سفر ایک لحاظ سے "بمبئی" سے "بمبئی" کے لیے تھا۔ ہندستان میں جو حیثیت بمبئی کی ہے۔ امریکہ کے اعتبار سے وہی حیثیت وہاں نیویارک کی ہے۔ نیویارک گویا زیادہ بڑا بمبئی ہے۔ چند سو سال پہلے نیویارک اور بمبئی دونوں یکساں طور پر سمندر کے کنارے کی دو معمولی بستیاں تھیں۔ مگر آج دونوں میں ترقی کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق ہو چکا ہے۔ بمبئی اگر ایک ملک کا اقتصادی مرکز ہے تو نیویارک ساری دنیا کا اقتصادی مرکز۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی ایک ساتھ سفر شروع کرتے ہیں۔ مگر بعد کے حالات ایک کو آگے کر دیتے ہیں اور دوسرے کو پیچھے۔

۴ نومبر کی صبح کو ہوائی جہاز دبئی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ دبئی کا ہوائی اڈہ بہت منظم اور شاندار ہے۔ سب سے پہلے ہم کو مسجد کی تلاش ہوئی۔ اوپر کی منزل پر پہونچے تو وہاں ایک کنارے چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ اسی کے ساتھ نہایت صاف ستھرا حمام بھی تھا۔ ہم نے وضو کر کے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

مسجد سے باہر نکلے تو خیال آیا کہ دبئی اور شارجہ میں کچھ لوگوں کو ٹیلیفون کیا جائے۔ دبئی میں مقامی ٹیلیفون کرنے کی کوئی قیمت نہیں۔ مقامی کال یہاں فری ہے۔ چنانچہ ہم نے دبئی کے ایک صاحب (شیخ علی الہاشمی) کا نمبر ملایا۔ نمبر فوراً مل گیا اور بغیر کسی اختلال کے گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد ایک

ٹیلی فون شارجہ (شکیل احمد چیف انجینیر) کو کرنا تھا۔ شارجہ ٹیلی فون کرنے کے لیے مشین میں ایک درہم ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہاں کا "درہم" موجود نہ تھا۔ شرطہ کے ایک عرب نوجوان (محمد یوسف عبداللہ) نے ہماری مشکل کو محسوس کیا۔ انھوں نے فوراً اپنی جیب سے ایک درہم نکالا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ لیجیے۔ قاعدہ ہے کہ تین منٹ کے بعد ٹیلی فون پر روشن حروف میں لکھ اٹھتا ہے کہ مزید رقم ڈالیے ہم بات کر رہے تھے تو استاذ محمد یوسف عبداللہ دوسرا درہم ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے تھے کہ جیسے ہی نشان ظاہر ہو فوراً دوسرا درہم مقررہ سوراخ میں ڈال دیں۔ مگر ابھی نشان ظاہر نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے احتیاطاً دوسرا درہم بطور خود ڈال دیا۔

یہ دبئی کا حال تھا۔ دوسری طرف دہلی کا حال یہ ہے کہ ہم نے دہلی ایرپورٹ سے گھر پر ٹیلی فون کرنا چاہا۔ دہلی میں مقامی ٹیلی فون کے لیے پچاس پیسے کا سکہ ڈالنا ہوتا ہے، ہمارے پاس روپیہ تھا، پچاس پیسے کا سکہ نہیں تھا۔ ایرپورٹ کے کئی لوگوں اور دکانداروں سے کہا کہ وہ روپیہ لے کر پچاس پیسے کے دو سکے دیدیں مگر کسی نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ بمشکل پچاس پیسہ کا سکہ حاصل کیا تو اب ٹیلی فون کے نظام کا حال یہ تھا کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود سلسلہ قائم نہیں ہوا اور بات نہ ہو سکی۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک ہی دنیا کے دو حصوں میں پایا جا رہا ہے۔

ہوائی کمپنیاں فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے خصوصی رعایتیں دیتی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ رعایتیں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً امریکہ کی ہوائی کمپنی (PAN AM) نے امریکی ہوائی اڈہ پر اترنے والے مسافروں کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ مخصوص قریبی مقامات پر انھیں ہیلی کاپٹر سے پہونچاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایرانڈیا کی اِن فلائٹ میگزین (نمسکار) نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں ایک صفحہ پر ایرانڈیا کے فرسٹ کلاس کا باتصویر اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایرانڈیا اپنے فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے کیا خاص خاص سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک چیز اس کے الفاظ میں یہ تھی:

A selection of the finest wines and liquor (p. 52)

یعنی بہترین اقسام کی منتخب شرابوں کی فراہمی۔ آزادی سے پہلے ہندستان کے مجاہدین آزادی شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرتے تھے۔ حتی کہ عربی مدارس کے مسلم طلبہ کی جماعت دہلی آتی تھی کہ یہاں شراب کی

دکانوں پر پکٹنگ کرے۔ یہ لوگ شراب کے خلاف مذہبی اور اخلاقی دلائل استعمال کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عمل کا کوئی بھی تعلق شراب کے مذہبی مسئلہ سے نہ تھا۔ اس کا مقصد صرف انگریزی حکومت کو لوگوں کی نظر میں برا دکھانا اور اس کے خلاف عوامی نفرت پیدا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اگرچہ ملک میں شراب کا رواج پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے مگر اب کوئی اس کے خلاف پکٹنگ کرنے والا نہیں۔ اس طرح کے سیاسی ذہن کے تحت جو تحریک چلائی جائے وہ صرف سماج کی برائیوں میں اضافہ پر ختم ہوتی ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی خوبصورت عنوان کے تحت شروع کیا گیا ہو۔

دبئی سے سات گھنٹہ مسلسل پرواز کرنے کے بعد ہمارا جہاز لندن پہونچا۔ یہ سفر بہت زیادہ اُکتا دینے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہزار سال پہلے کوئی شخص کہتا کہ وہ عرب سے انگلستان تک کا سفر سات گھنٹہ میں کرا دے گا تو لوگ اس کو عجوبہ سمجھتے اور جب وہ واقعۃً لوگوں کو سواری میں بٹھا کر سات گھنٹہ میں عرب سے انگلستان پہونچا دیتا تو لوگوں کو یہ مدت اتنی کم معلوم ہوتی کہ وہ کہتے کہ ابھی ہم سواری پر بیٹھے تھے اور ابھی اتر گیے۔ مگر آج تیز رفتار سواری کے دور میں سات گھنٹہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے ـــــ انسان اکثر اضافی اصطلاحوں میں سوچتا ہے۔ مگر اکثر وہ غلطی سے سمجھ لیتا ہے کہ وہ حقیقی اصطلاحوں میں سوچ رہا ہے۔

لندن ایرپورٹ پر ایک گھنٹہ گزرا۔ یہاں کا ہوائی اڈہ بہت بڑا ہے۔ ہوائی اڈہ پر اندراجات انگریزی کے بعد عربی زبان میں نظر آئے۔ ہوائی اڈہ پر ایسا معلوم ہوا گویا یہاں انگریزی کے بعد دوسری زبان عربی ہے۔ یہاں ٹیلی فون کا نظام نہایت معیاری ہے۔ آپ ایرپورٹ پر لگی ہوئی مشین میں رقم ڈال کر ملک کے کسی بھی حصہ میں براہ راست ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک صاحب نے اسی طرح برمنگھم سے بات کی۔ لندن اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ چنانچہ ہم نے ایرپورٹ پر ٹیلی فون کر کے دہلی سے بات کی۔ صرف ایک بار ڈائل کرنے میں لائن مل گئی۔ آواز اتنی صاف تھی گویا کہ بالکل قریب سے بات ہو رہی ہو، اس کے مقابلہ میں دہلی میں ٹیلی فون کا حال یہ ہے کہ ایک مرتبہ انگریزی اخبار میں لطیفہ شائع ہوا تھا۔ ایک شخص نے دہلی فون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا " دہلی کے نصف باشندے کنکشن کا انتظار کر رہے ہیں اور بقیہ نصف ڈائل ٹون کا :

While half the people in the Capital are waiting for their telephone connections, the remainder are waiting for the dial tone.

لندن سے جہاز روانہ ہوا تو اعلان ہوا کہ لندن سے نیویارک تک کی دوری سات گھنٹہ میں پوری کی جائے گی۔ سات گھنٹہ کا لفظ حوصلہ شکن تھا۔ کیوں کہ دبئی سے لندن تک کے سات گھنٹے بہت اکتا دینے والے ثابت ہوئے تھے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ سفر بہت آسانی سے طے ہوگیا۔ "ہم نیویارک پہونچنے والے ہیں" کا اعلان سنائی دیا تو ایسا محسوس ہوا گویا سات گھنٹے صرف سات منٹ میں پورے ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دبئی سے لندن تک کا وقت زیادہ تر جاگنے میں گزرا تھا۔ مگر جہاز جب لندن سے چلا تو ہمیں نیند آگئی اور تقریباً پورا سفر نیند کی حالت میں طے ہوا۔ یہاں تک کہ نیند اس وقت کھلی جب کہ جہاز کے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ "اپنی پیٹی باندھ لیں" نیند بھی کیسی عجیب نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے راحت و سکون کے لیے بنائی ہے۔

نیویارک کے جے ایف کے ایرپورٹ میں داخل ہوئے تو وہاں دیوار پر ہر زبان میں "ویلکم" لکھا ہوا تھا۔ سواگتم، خوش آمدید اور مرحبا کے الفاظ بھی لکھے ہوئے نظر آئے۔ اس طرح گویا نیویارک کا ایرپورٹ بزبان حال اعلان کر رہا تھا کہ آپ ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ پر پہونچ گئے ہیں۔

ایرپورٹ پر "اسمبلی آف دی ورلڈز ریلیجنز" کے نمائندے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا بینر لیے ہوئے موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں نیویارک سے نیوجرسی کا سفر شروع ہوا۔ نیوجرسی اور نیویارک کے درمیان تقریباً پچاس میل کا فاصلہ ہے۔ نیوجرسی اگرچہ ایک الگ علاقہ ہے تاہم وہ "عظیم تر نیویارک" کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

نیوجرسی میں ایک بہت بڑا ہوٹل ہے جو آٹھ سو ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ یہ رزورٹ (Resort) کے انداز میں پہاڑیوں اور سرسبز درختوں کے ماحول میں بنایا گیا ہے۔ بڑی بڑی کانفرنسیں اکثر اسی ہوٹل میں ہوتی ہیں۔ موجودہ کانفرنس کے لیے دنیا بھر سے ہر مذہب کے نمائندے بلائے گیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ کانفرنس کے دوران ایک ہفتہ کے لیے پورا ہوٹل رزرو کر لیا گیا تھا۔ میرا قیام یہاں کمرہ نمبر ۶۲۲ میں تھا۔ ہوٹل کا نام و پتہ یہ ہے:

Americana Great Gorge Resort
Route 517, Mc Afee, New Jersey 07428 U.S.A.

کانفرنس کے منتظمین نے شرکاء کے لیے ہر قسم کا بہترین انتظام کیا تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک مذہبی

کانفرنس تھی، کانفرنس کی گائڈ بک میں یہ الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے :

Alcoholic beverages will not be provided

یعنی کانفرنس کے ذمہ داروں کی طرف سے شرکا کے لیے شراب نہیں مہیا کی جائے گی۔

۱۵۰۰ء تک امریکہ ایک بالکل ناقابل ذکر علاقہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت تک امریکنوں کے پاس پہیہ دار گاڑیاں بھی نہیں تھیں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس کی کشتی اتفاقاً امریکہ کے ساحل پر پہونچی۔ کولمبس ایک اسپینی باشندہ تھا اور ایک عرب ملاح کے ساتھ اٹلانٹک میں سفر کر رہا تھا کہ وہ امریکہ کی سرزمین میں پہونچ گیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یورپی باشندے امریکہ آنا شروع ہوئے ۱۵۶۵ء میں اسپینیوں نے شمالی امریکہ میں پہلا قلعہ بنایا۔ اس وقت جو لوگ یورپ سے امریکہ آئے ان کو قدیم امریکی باشندوں نے آسمانی لوگ (Men from the sky) کا نام دیا۔

۱۶۰۷ میں برطانی لوگ اٹلانٹک کو پار کرکے امریکہ پہونچے۔ انھوں نے ورجینیا میں اپنی پہلی آبادی قائم کی۔ اس وقت امریکہ کی زمین اتنی کم قیمت رکھتی تھی کہ منہاٹن کے باشندوں نے صرف ۲۴ ڈالر میں منہاٹن کا پورا جزیرہ ڈچ کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ فرانسیسیوں نے یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ ابتداءً امریکہ مختلف یورپی قوموں کی شکارگاہ رہا۔ جس میں برطانی قوم کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگست ۱۷۷۶ کی جنگ کے بعد برطانیہ نے نیویارک پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مزید علاقے اس کے قبضہ میں آتے رہے۔ آزادی کے بعد ۱۷۸۷ میں امریکہ کا پہلا دستور بنا۔

۱۷۹۰ میں پہلی بار امریکہ کی مردم شماری ہوئی اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کل آبادی تقریباً چار ملین تھی۔ امریکہ قدرتی ذخیروں سے مالا مال ہے۔ چنانچہ اس کی دریافت کے بعد مختلف ملکوں کے لوگ کثرت سے آکر امریکہ میں بسنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ تک اس کی آبادی ۱۰۶ ملین تک پہونچ گئی۔ ان میں آٹھ ملین صرف انگریز تھے۔

یہ امریکہ کے لیے ایک ایڈوانٹج بن گیا۔ کیوں کہ اس طرح سے جو افراد آئے وہ سب حوصلہ مند اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ تھے۔ چنانچہ امریکہ نے تیزی سے ترقی شروع کی۔ ۱۹۱۴ کی جنگ عظیم میں امریکہ نے عالمی صنعتی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ اور دوسری جنگ عظیم نے امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔

امریکہ میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کی تقسیم حسب ذیل ہے ــــ پروٹسٹنٹ ۵۵ فی صد۔ رومن کیتھولک ۲۷ فی صد۔ یہودی ۴ فیصد۔ آرتھوڈاکس ایسٹرن چرچ ۳ فی صد۔ بقیہ ایک فیصد۔ آبادی کے لحاظ سے امریکہ کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔

امریکہ کا اصل دین تجارت ہے۔ صدر کالوین کولج (Calvin Coolidge) نے کہا تھا کہ امریکہ کا کام تجارت کرنا ہے:

(The business of America is business)

مگر ہندستان کے بنیا اور امریکہ کے بنیا میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کا بنیا صرف بنیا ہے اور امریکہ کا بنیا سائنٹفک بنیا۔ اس وقت امریکہ کی سب سے بڑی تجارت اس کے جدید ترین ہتھیار ہیں۔ ۱۹۸۴ میں امریکہ نے ۸۰۰ ملین ڈالر کا ہتھیار ایشیائی ملکوں کے ہاتھ فروخت کیا۔

امریکہ کی دلچسپی زیادہ تر بھاری صنعتوں میں ہے۔ مگر جاپان کے تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ "چھوٹی" صنعتیں بھی "بھاری" صنعتوں کو شکست دے سکتی ہیں۔ مثلاً امریکہ بڑی بڑی قیمتی کاروں کے بنانے میں اجارہ داری حاصل کیے ہوئے تھا۔ جاپان نے چھوٹی کم خرچ کاریں بنانی شروع کیں۔ جاپان کو اس معاملے میں اتنی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ آج امریکہ کی سڑکیں جاپانی کاروں سے بھری ہوئی ہیں۔ کوئی قوم خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کے اندر کوئی گوشہ خالی رہتا ہے۔ اس خالی گوشہ سے داخل ہو کر آپ اس کے اوپر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) نے ۱۹۲۸ میں کہا تھا کہ بہت جلد ہم خدا کی مدد سے امریکہ سے غریبی کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر اس کے بعد ۱۹۲۹ اور ۱۹۳۲ کے درمیان زبردست تجارتی بحران (Depression) آیا۔ اس میں پانچ ہزار بنک بند ہو گیے۔ کارخانوں کا مال بکنا موقوف ہو گیا۔ امریکہ کی ایک تہائی آبادی کا یہ حال ہوا کہ وہ بے روزگاری کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ اقتصادی بحران قوت خریداری نہ ہونے سے پیدا ہوا تھا نہ کہ سامانِ خریداری نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ وہ عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوئی جو اس سے پہلے دنیا میں کبھی نہیں آئی تھی:

People went hungry while fruit, vegetables and grain were in abundance. Houses were unheated while coal piled up in mountains.

لوگ بھوکے تھے، جب کہ پھل اور سبزی اور غلّہ افراط کے ساتھ پایا جارہا تھا۔ مکانات ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے جب کہ پہاڑوں میں کوئلہ کا ڈھیر موجود تھا۔

آج بظاہر امریکہ میں خوش حالی ہے۔ مگر یہ خوش حالی سراسر مصنوعی ہے۔ امریکی آبادی کا پچاس فی صد سے زیادہ حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ یہاں ہر آدمی کے پاس بینک کا کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔ اس سے وہ کوئی بھی چیز ادھار لے سکتا ہے ـــــ کار، ٹیلی وزن، مکان وغیرہ وغیرہ۔ اس سہولت کی وجہ سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بڑھائے۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی حقیقی آمدنی سے آگے بڑھ کر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ قرض پر گھر بناتا ہے جو اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر ہر قسم کے تعیّش کے سامان جمع کرتا ہے۔ یہ تمام قرضے سودی قرضے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا بیشتر حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ وہ ساری عمر ان کے سود ادا کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجاتا ہے۔

خود امریکی حکومت کا حال اس سے مختلف نہیں۔ ڈالر کی برتری قائم رکھنے کے لیے امریکی حکومت ڈالر پر بہت بڑھی ہوئی شرح سود دیتی ہے تاکہ لوگ اس کے بینکوں میں اپنا ڈالر جمع کریں۔ چنانچہ زیادہ سود کا لالچ دے کر امریکہ دنیا بھر کا ڈالر اپنے یہاں جمع کرلیتا ہے۔ اس طرح امریکی اقتصادیات میں زبردست کثرت نظر آتی ہے مگر یہ کثرت سراسر مصنوعی ہے۔ اگر دنیا بھر کے لوگ امریکی بینکوں سے اپنا ڈالر واپس لے لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہوجائے گا۔

۱۵ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ ہوٹل کے ایک مخصوص کمرہ میں اجتماع کے مسلم شرکاء اکٹھا ہوئے اور جمعہ کی نماز ادا کی۔ دکتور عصفوری (Dr. Z. Asfoury) نے نماز پڑھائی۔ وہ مصری ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ انھوں نے فرش پر کھڑے ہوکر صرف ایک خطبہ دیا۔ درمیان میں بیٹھے نہیں۔ خطبہ میں عربی زبان کی اہمیت پر زور تھا۔ انھوں نے کہا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو صرف ایک زبان (عربی زبان) اختیار کرلینا چاہیے۔ ایک خطبہ کے بعد انھوں نے نماز پڑھائی تو اس میں پہلی رکعت میں قل ھو اللہ کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں الم نشرح کی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی۔

ہندستان میں کوئی شخص اس طرح نماز پڑھائے تو تمام نمازی کہہ اٹھیں گے کہ نماز نہیں ہوئی، اس کو دہراؤ۔ مگر یہاں کوئی شخص کچھ نہ بولا۔ نماز ادا کرنے کے بعد کچھ لوگ سنتوں میں مشغول ہوگئے،

اور کچھ لوگ خاموشی سے باہر چلے گیے۔

۱۵ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ جدید طرز کے وسیع ہال میں ۸۵ ملکوں کے آٹھ سو سے زیادہ افراد موجود تھے جو روئے زمین کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۳ میں (World's Parliament of Religions) عالمی مذاہب کانفرنس شکاگو میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان سے سوامی ویویکانند بحری سفر کرکے بڑی دشواریوں کے ساتھ شکاگو پہونچے تھے۔ وہ اس کانفرنس میں مدعو نہ تھے۔ محض ذاتی شوق سے وہاں گیے تھے۔ چنانچہ ان کو بڑی مشکل سے اس میں داخل ہونے اور تقریر کرنے کی اجازت ملی۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس لفظ سے کیا تھا کہ امریکہ کے بہنوں اور بھائیو :

Sisters and brothers of America

نوے سال پہلے سوامی ویویکانند کا یہ انداز واقعہ کے مطابق تھا۔ کیوں کہ ۱۸۹۳ کی کانفرنس میں زیادہ تر امریکہ کے لوگ شامل تھے۔ مگر موجودہ کانفرنس کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ موجودہ کانفرنس "امریکی بہنوں اور بھائیوں" کی کانفرنس نہ تھی بلکہ وہ پورے کرۂ ارض کے تمام مذاہب کے نمائندوں کی کانفرنس تھی۔ چنانچہ اس کے صدر نے جب "اسمبلی" کا افتتاح کیا تو اس نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی :

Sisters and brothers, from south and north, from east and west

اس کانفرنس میں اول سے آخر تک صرف ایک زبان استعمال ہوئی اور وہ انگریزی تھی۔ لوگوں کے عقائد، ان کے حلیے اور ان کے لباس ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مگر سب ایک ہی زبان (انگریزی) بولتے تھے۔ اگرچہ لوگوں کے لہجہ میں کافی فرق تھا۔ مثلاً کوئی entity کو انٹائٹی کہتا تھا۔ کوئی your کو یوار۔ کوئی values کو فیلوز۔ کوئی modern کو ماڈرن۔ کوئی those کو زوز وغیرہ۔

انگریزی کا یہ استعمال انگریزی تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔ اولاً برطانیہ عظمیٰ نے انگریزی کو عالمی زبان بنایا۔ بیسویں صدی میں جب برطانیہ عظمیٰ نے عالمی طاقت کی حیثیت کھو دی تو امریکہ اس کی جگہ زیادہ بڑے پیمانہ پر عالمی طاقت بن چکا تھا۔ انگریزی زبان کا یہ عمومی استعمال بر بنائے واقعہ

تھا نہ کہ بر بنائے تعصب۔ اگر ہم اس کو تعصب سمجھیں تو اس کے خلاف احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو ایک واقعہ سمجھیں تو انگریزی زبان کی یہ توسیع ہم کو ایک نعمت معلوم ہوگی۔ اس سے ہمارے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ کسی ایک زبان کے ذریعہ دنیا بھر کے تمام انسانوں کو خطاب کیا جا سکے۔

پوری کانفرنس میں غالباً صرف ایک شخص تھا جو انگریزی زبان سے واقف نہ تھا۔ یہ افریقہ کے قبائلی مذہب کا پیشوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں آیا تھا۔ وہ اپنے کندھے پر برابر ایک خاص طرح کا کوڑا رکھے رہتا تھا۔ وہ اپنی مقامی زبان میں بولتا تھا اور ایک شخص اس کی گفتگو کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرتا تھا۔ اس کے لیے ترجمان کا یہ استثنائی انتظام غالباً اس لیے کیا گیا تھا تاکہ مذاہب کی فہرست نامکمل نہ رہ جائے۔

اس کانفرنس کی منصوبہ بندی دو سال پہلے سے ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس کی ایک ایک بات پہلے سے طے شدہ تھی۔ اجتماع کے بارہ میں چھوٹی بڑی تمام تفصیلات کاغذ پر مرتب کر کے مدعو حضرات کو بھیج دی گئی تھیں۔ ہر شخص کو پیشگی طور پر معلوم تھا کہ کس روز اس کو نیویارک پہونچنا ہے۔ کس روز وہاں سے روانہ ہونا ہے اور اس درمیان میں اس کو کن کن کارروائیوں میں حصہ لینا ہے۔ اس سلسلہ میں منتظمین کی طرف سے اتنے خطوط اور کاغذات موصول ہوئے کہ ان کا ایک پورا فائل بن گیا۔ راقم الحروف کو اس کا دعوت نامہ چھ ماہ پہلے مل چکا تھا۔ میں نے بہت سی مسلم کانفرنسوں میں شرکت کی ہے مگر اتنا نظم اور اتنی مکمل منصوبہ بندی مجھے کسی مسلم کانفرنس میں نظر نہ آئی۔

اگرچہ شرکا، خاص طور پر مشرقی ممالک کے شرکا نظم کی پوری پابندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ مثال کے طور پر جن لوگوں سے مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی گئی تھی ان سے کہا گیا تھا کہ مقالہ کو جدید الکٹرانک ٹائپ رائٹر پر دونوں طرف برابر سطروں (Both side aligned) میں ٹائپ کر کے بھیجیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے اپنا مقالہ عین اسی قاعدہ کے مطابق ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ مگر وہاں میں نے دیکھا کہ بہت کم لوگوں نے اس کی پابندی کی تھی۔ زیادہ تر مقالے عام طرز کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرائے گئے تھے جو ایک طرف برابر ہوتے ہیں اور دوسری طرف غیر برابر۔

نیویارک کی اس "اسمبلی" میں تمام مذہب کے نمائندے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ وہ ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ بے تکلف ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ ایک ہال میں جمع ہوکر ایک دوسرے کی باتیں سنتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ کہیں مناظرہ کی فضا پیدا نہیں ہو رہی تھی اور نہ کہیں متعصبانہ سلوک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں میں نے اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کے لوگوں سے باتیں کیں۔ مگر کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی ناخوش گوار صورت حال سامنے نہیں آئی۔

یہ بالکل ایک نئی چیز ہے۔ یہ صرف دور جدید میں ممکن ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ سنجیدہ ذہن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں، اور کسی اشتعال کے بغیر ایک دوسرے کی باتیں سنیں۔ قدیم زمانہ میں اس طرح کی مذہبی یک جائی ممکن نہ تھی۔ اس صورت حال نے ہمارے لیے دین کے تعارف کا بالکل نیا امکان کھول دیا ہے، ایک ایسا امکان جو اس سے پہلے کبھی پایا نہ جاتا تھا۔

۱۵ نومبر کی شام کو صرف افتتاح کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد پروگرام کی ترتیب یہ تھی کہ ہر روز بڑے ہال میں ایک عام اجتماع ہوتا جس میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات پیش کرتے۔ اس کے بعد حلقہ وار اجتماعات ہوتے۔ تمام لوگ بارہ موضوعات کے تحت بارہ حلقوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ہر حلقہ روزانہ اپنے اپنے موضوع پر بحث کرتا اور کسی متفقہ رائے تک پہونچنے کی کوشش کرتا۔ میرا تعلق (Theme Group 12-A) سے تھا۔

اس اجتماع میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں افریقہ کے قبائلی مذہب کے نمائندے بھی تھے جو بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کے پیشوا اپنے عجیب وغریب عقائد کے تحت اپنے چہرہ کو گرم لوہے سے اس طرح داغتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے ان کے چہرے پر اس کا نشان پڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں ایسے مذاہب کے نمائندے بھی تھے جن کے پیشوا انتہائی جدید طرز پر رہتے ہیں۔ وہ رولس رائس کاروں پر سفر کرتے ہیں۔ اور ان کے پاس ان کے ذاتی ہوائی جہاز ہیں۔ اس کانفرنس میں بت پرست بھی تھے اور خدا پرست بھی۔ ان میں روح کو پوجنے والے بھی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خدا جیسی کسی چیز کو سرے سے نہیں مانتے۔

چنانچہ اس اجتماع میں ایک طرف خدا اور مذہب کی باتیں سننے میں آتی تھیں اور دوسری طرف خدا اور مذہب کے خلاف باتیں بھی۔ ان میں سے چند جملے یہ ہیں:

TITLES: WRITTEN CONTRIBUTIONS

Assembly of the World's Religions

Theme Group 12A

"Morality, Ethics and Values"

Rev. Dr. Oyinloye Samuel Abogunrin	COVENANT IN THE ETHICAL SYSTEM OF THE YORUBA
Dr. Anis Ahmad	'ADL AS A MAJOR OBJECTIVE OF ETHICS, MORALITY AND LAW IN ISLAM
Dr. Gianni Ambrosio	SOCIAL CHANGE AND MORAL QUESTIONS
Dr. Elizabeth Amoah	MODERATOR
Dr. Shlomo Biderman	IS JEWISH ETHICS POSSIBLE?
Father Laurent Bilgho	TRADITIONAL VALUES IN THE RELIGION OF MOSSI TRIBE "THE MOAAGA FAMILY"
Dr. Pal - Khn Chon	WON BUDDHIST VIEW ON EQUALITY
Dr. Abdullah Ciptoprawiro	ETHICS AS A MEANS TOWARDS SELF-REALIZATION AND PERFECTION
Mr. John Dickson	OBSERVER
Dasho Rigzin Dorji	MORALITY, ETHICS AND VALUES
Venerable Sonam Gyaltsen	COMPASSION AND BODHICITTA IN TIBETAN BUDDHISM
Dr. Erik Hoogcarspel	THE ETHICAL FOUNDATION OF INTERRELIGIOUS COMMUNICATION
Chief Ogundiya Iroko	OGUN AND YORUBA TRADITIONAL VALUES
Maulana Wahiduddin Khan	THE CONCEPT OF MORALITY IN ISLAM
Mr. Zillur Rahman Mollah	RELIGION AND MORALITY WITH SPECIAL REFERENCE TO ISLAM
Professor Adrian T. Peperzak	"VALUES" IN RELIGION AND MORALITY
Dr. Ramon C. Reyes	MORAL REFLEXION AS HERMENEUTICAL: FROM THE TELEOLOGICAL TO THE HISTORICAL
Dr. Abdulaziz A. Sachedina	THE IMPORTANCE OF LEADERSHIP IN NURTURING THE GOOD SOCIETY: THE ISLAMIC PRESCRIPTION
Mr. Nimal Samarasundera	BUDDHIST ETHICS FOR WORLD PEACE
Pandit Chintaman Gowkarran Sharma	MORALITY, MORALS AND ETHICS
Professor Fernando Tola	ETHICS OF THE BHAGAVAD-GITA FOR THE MODERN WORLD
Reverend Levi Chris Williams	RELIGION AND BIOETHICS

The God of the theologians is dead.
I am a Buddhist, there is no God for me.
Life is nothing but a chemical process.
There is no other God than Truth.
Religious people are God-centered people.
I have no belief in God, but I do profess faith in the spirit of Man.
Man, ethically, is an end in himself.
The main aim of religion is peace and happiness.

اسلامی نقطۂ نظر سے اگر اس کانفرنس کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ بیشتر مذاہب کے نمائندوں نے یہ کہا کہ مذہب کا مقصد شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے نمائندوں نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام کی امتیازی صفت یہ بیان کی کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں، وہ پورے اجتماعی نظام میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے کہ نہ اجتماع۔ اجتماعی تغیر اس کا بالواسطہ جز ہے نہ کہ براہ راست۔ تاہم میں نے اس سے اعراض کیا کہ کانفرنس میں دیگر مذاہب کے نمائندوں کے سامنے مسلمانوں سے اختلافی بحث کرنے لگوں۔ البتہ الگ سے ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی مذکورہ تعبیر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ہی خود اسلام کا مقصد بھی ہے جس طرح وہ دوسرے مذاہب کا مقصد بتایا جاتا ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو فرق ہے وہ کامل اور ناقص کا نہیں بلکہ مستند اور غیر مستند کا ہے۔ اسلام دین خداوندی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے جب کہ دوسرے مذاہب دین خداوندی کا بگڑا ہوا اڈیشن۔ اصل مقصد کے اعتبار سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ مگر مقصد کے حصول کے لیے آج صرف اسلام ہی قابل اعتبار ماخذ ہے نہ کہ دوسرے مذاہب۔ دوسرے مذاہب اپنی اعتباریت کھو چکے ہیں۔

تحریف و تغیر کی وجہ سے دوسرے مذاہب میں اصل حقیقت بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً ہندوازم انسانی شخصیت کی تعمیر معرفت خویش (Self realization) میں بتاتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تعمیر کا راز معرفت خدا (God realization) میں پوشیدہ ہے۔ عیسائیت کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو ابن اللہ کی حیثیت سے پائے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو خدا کے پیغام رساں کی حیثیت سے پا سکے۔ بدھزم اخلاقی احساس پیدا کرنے کا سرچشمہ موجودہ دنیا

میں تلاش کرتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسان کے اندر اخلاقی احساس پیدا کرنے کا ذریعہ آخرت کی جواب دہی کا یقین ہے۔ بعض مذاہب کے نزدیک انسانی شخصیت اس طرح بنتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کو سچا سمجھے جب کہ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے اور اسی ایک سچائی کو دریافت کرکے وہ اپنی ذات کو ارتقار کی طرف لے جا سکتا ہے۔ بعض مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ فرد موت وحیات کے لمبے مراحل سے گزر کر اپنی انتہا کو پہونچتا ہے، جب کہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں کے عمل کی بنیاد پر آدمی موت کے بعد اپنا اچھا یا بُرا انجام پاتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں تحریف کی وجہ سے خدا کی بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جب کہ اسلام میں خدا کی بات اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ انسان پورے اعتماد کے ساتھ اسلام کو اختیار کر سکتا ہے جب کہ دوسرے مذاہب کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کتاب کے صحیح اور مستند اڈیشن کی موجودگی میں اس کے ایسے نسخوں کو اپنے علم کا ماخذ بنایا جائے جس میں زمانہ کی دستبرد سے بے شمار غلطیاں ہو گئی ہوں۔

۱۸ نومبر کو ہم لوگ قافلہ کی صورت میں نیوجرسی سے نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ آج کا دن نیویارک کے اہم مقامات کو دیکھنے کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ ایک شخص جس نے نیویارک نہ دیکھا ہو اس کے ذہن میں نیویارک کی عظمت کا افسانوی تصور ہوتا ہے ـــــ تاریخ کی سب سے اونچی عمارتوں کا شہر، جدید صنعتی تمدن کا سب سے بڑا مرکز، وغیرہ۔ مگر جب ہم نے نیویارک پہونچ کر اس کو دیکھا تو اس کی عظمت کا طلسم ٹوٹ گیا وہ اس سے کم نظر آیا جتنا وہ خیالی طور پر محسوس ہوتا تھا۔ نیویارک صرف نیویارک تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

نیویارک میں ہم نے اقوام متحدہ (United Nations) کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا جان ڈی راکفلر نے نیویارک میں سمندر کے کنارے سترہ ایکڑ کی قیمتی زمین اقوام متحدہ کے لیے وقف کر دی۔ اس پر اقوام متحدہ کے صدر دفاتر کی عمارتیں بنائی گئیں۔ سترہ ایکڑ کا یہ علاقہ ایک آزاد علاقہ ہے۔ یہ صرف اس کے سکریٹری جنرل کے حکم کے تابع ہے۔

اقوام متحدہ کی بلند و بالا عمارتوں میں گھومتے ہوئے ہم اس کے ایک ہال میں پہونچے۔ یہاں اس وقت ٹرسٹی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وسیع ہال میں نیچے اوپر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مگر مقرر

اور دفتری کارکنوں کے سوا تقریباً سب کی سب خالی تھیں، اسٹیج پر ایک مقرر تقریر کر رہا تھا جس کی ہلکی آواز خالی ہال میں گونج رہی تھی۔ وہاں سننے والے اتنے کم تھے کہ بے شمار کرسیوں کے درمیان انھیں تلاش کرنا پڑتا تھا کہ کچھ سننے والے ہیں بھی یا نہیں۔ اس کے قوام متحدہ کے سب سے بڑے ہال میں پہونچے جو جنرل اسمبلی کے اجلاس کے لیے خاص ہے۔ آج یہاں نمیبیا کے مسئلہ پر اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک شخص اسٹیج پر بیٹھا ہوا انگریزی میں تقریر کر رہا تھا۔ جس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ امریکی وزیر خارجہ جارج شلز بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر یہاں بھی یہ حال تھا کہ جنرل اسمبلی کے ۱۶۰ ممبر ممالک کی تعداد کے بقدر بھی سامعین موجود نہ تھے۔ سننے والے اتنے کم تھے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کرسیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔

اقوام متحدہ کی وسیع عمارتوں کے باہر ایک بہت بڑا اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ یہ ایک طاقت ور آدمی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا۔ وہ پوری طاقت سے بھاری ہتھوڑے کو تلوار پر مار رہا ہے۔ آرٹ کا یہ نمونہ سوویت روس نے ۱۹۵۹ میں اقوام متحدہ کو بطور عطیہ دیا تھا۔ اس پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

We shall beat our swords into plowshares

ہم اپنی تلواروں کو توڑ کر ان کے ہل بنائیں گے۔

۲۴ جون ۱۹۴۵ کو پچاس ملکوں نے مل کر اقوام متحدہ کو قائم کیا تھا۔ اب اس کے ممبر ملکوں کی تعداد ۱۶۰ ہو چکی ہے۔ ابتدائی عہد نامہ کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے برباد شدہ دنیا کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ دنیا کو امن، تحفظ، ترقی اور باہمی احترام کا ماحول دیا جائے۔ اور قوموں کا ایک عالمی نظام (International order) قائم کیا جائے۔ مگر اقوام متحدہ پر چالیس سال گزر گیے اور اب تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس مدت میں قوموں کے درمیان پیدا ہونے والے سیکڑوں مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کو بھی اس نے حل نہیں کیا۔ آج اقوام متحدہ قوموں کی امیدوں کا مزار ہے نہ کہ قوموں کی امیدوں کی تکمیل کا قلعہ۔ اقوام متحدہ کی رونق اب صرف ان لوگوں کے ذریعہ ہے جو اس کو دیکھنے کے لیے ہر روز بڑی تعداد میں آتے ہیں اور جن کی اکثریت اسکول کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر یہ دیکھنے والے لوگ نہ آئیں تو شاید اقوام متحدہ کے ادارہ میں قبرستان کا سناٹا

نظر آئے ـــــ تصویر میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا آسان ہے اور عملی واقعہ میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا مشکل۔

نیویارک کی غیر معمولی وسعت کے لحاظ سے اس کی اندرونی سڑکیں تنگ نظر آئیں۔ دونوں طرف انتہائی اونچی عمارتوں کی قطار کے درمیان اس کی سڑکیں گلیوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ نیویارک اپنی انتہائی اونچی عمارتوں کے لیے مشہور ہے۔ یہ عمارتیں ضرورت کی پیداوار ہیں۔ لوگوں کے لیے افقی اضافہ (Horizontal growth) کا موقع نہ تھا اس لیے انھوں نے (Vertical growth) عمودی اضافہ کا عمارتی طریقہ اختیار کر لیا۔ تاہم یہ طریقہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ نیویارک کی زمین بیشتر چٹانی ہے۔ دہلی کی جامع مسجد ایک چٹان پر بنائی گئی ہے۔ یہی معاملہ نیویارک کا ہے۔ نیویارک کی زمین کی سطح اگر چٹانی نہ ہوتی تو یہاں اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کرنا ممکن نہ ہوتا۔

نیویارک کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ اس کی تعمیر میں ۶۰ ہزار ٹن لوہا استعمال ہوا ہے۔ اس میں ۱۸۶۰ سیڑھیاں ہیں۔ تاہم لفٹ کے ذریعہ آدمی صرف تین منٹ میں ۱۰۲ منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ البتہ اس کے لیے اسے تین لفٹ بدلنی پڑتی ہے۔ ایک زمانہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب اس سے بھی زیادہ اونچی بلڈنگیں تیار ہو گئی ہیں۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت ۱۰۷ منزلہ ہے۔ شکاگو کے سیرس ٹاور (Sears Tower) کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ وغیرہ۔

نیویارک کی اونچی بلڈنگوں کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک لطیفہ ہے ہے کہ ایک آدمی ایک اونچی بلڈنگ میں آیا۔ اس کو اوپر جانا تھا۔ جب وہ بلڈنگ کی لفٹ کے پاس پہونچا تو وہاں یہ نوٹس لگا ہوا تھا:

Complaints department on the 45th floor.
Lift out of order: please use the stairs.

شکایت کا شعبہ ۴۵ ویں منزل پر ہے۔ لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ براہ کرم سیڑھیاں استعمال کریں۔

۱۸ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کی ایک نشست نیویارک شہر میں ہوئی۔ یہ نشست میٹروپولیٹن

باپٹسٹ چرچ میں تھی۔ یہاں اچاریہ سوشیل منی کمار اور ڈاکٹر جوزف پیگ وغیرہ کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے دوران زبردست تالیاں بجتی رہیں۔ کارروائی کے آخر میں "قرأت" کا پروگرام تھا۔ انگریزی انجیل کا ایک حصہ نہایت تجوید کے ساتھ پڑھا گیا۔ انجیل کی یہ قرأت جس شخص نے کی اس کا تعارف ساری دنیا میں انجیل کے بہترین قاری (Best Gospel singer of the world) کی حیثیت سے کرایا گیا۔ پہلے ایک شخص نے قرأت کی۔ اس کے بعد چار آدمیوں نے مل کر انجیل کا ایک حصہ کورس کی شکل میں پڑھا۔

اسمبلی کے اجتماع (امریکانا ہوٹل) میں ہر مذہب کے نمائندے روزانہ اپنے مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کرتے تھے۔ ۱۹ نومبر کو منی سوشیل کمار نے جین مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کی۔ اسی طرح بدھ ازم، ہندو ازم، سکھ ازم، یہودیت، زرتشت وغیرہ کی مقدس کتابیں پڑھی گئیں۔ ان قرأتوں کو سن کر میرے ذہن نے ان کا مقابلہ قرآن کی قرأت سے کیا۔ اس مقابلہ میں قرآن کی قرأت اتنی اعلیٰ اور جاذب نظر آئی کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسری تمام کتابوں کے الفاظ انسانی الفاظ ہیں اور قرآن کے الفاظ خدائی الفاظ۔ اس کی وجہ سے قرآن کے الفاظ میں ایک عجیب عظمت اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے جو کسی دوسری مذہبی کتاب میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ساؤنڈ آرٹ (Sound art) کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دنیا کی کوئی بھی کتاب اس معاملہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں ایک موثر دعوتی طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسے ٹیپ تیار کیے جائیں جن میں مختلف مذہبی کتابوں کی قرأت ریکارڈ کی گئی ہو۔ ہر مذہب کی کتاب کی قرأت اسی مذہب کے قاری کے ذریعے کرائی جائے۔ اور پھر اس میں قرآن کی قرأت ایک اچھے قاری سے کرا کر شامل کی جائے۔ یہ کام اگر ویڈیو کیسٹ پر کرایا جائے تو اور بھی اچھا ہے تاکہ سننے والے یہ بھی دیکھیں کہ جس مذہبی کتاب کی قرأت ہے اس کو اسی مذہب کا ایک ماہر آدمی پڑھ رہا ہے۔ اگر اس طرح کے ویڈیو کیسٹ یا ریکارڈ تیار کرائے جائیں اور ان کو جگہ جگہ سنایا جائے تو صرف زبان اور آواز کا تقابل لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کافی ہوگا کہ کون سی کتاب انسانی کتاب ہے اور کون سی کتاب خالص خدائی کتاب۔

1 ۲۹ دسمبر ۱۹۸۵ مہینہ کے آخری اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول مرکز (نظام الدین) میں ہفتہ وار درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے بعض قرآنی آیات کی روشنی میں واضح کیا کہ وہ کیا چیز ہے جس کو قرآن میں ازدیاد ایمان (اضافہ ایمان) کہا گیا ہے۔ اس درس کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔

2 الرسالہ کا ذکر اب خدا کے فضل سے عالمی پریس میں آنے لگا ہے۔ انگلینڈ (لیسٹر) سے ایک جرنل نکلتا ہے جس کا نام ہے مسلم ورلڈ (The Muslim World) اس نے اپنی اشاعت نمبر ۲، ۱۹۸۶ میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں ان مضامین کا احاطہ ہے جو "اسلام اور یورپ" کے موضوع پر لکھے گیے ہیں۔ اس میں اس نے صفحہ ۶۲ پر الرسالہ کے مضمون کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

3 ۲۹ دسمبر ۱۹۸۵ کی شام کو نیتی باغ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور خواتین نے شرکت کی۔ مرکز کو بھی اس کا دعوت نامہ ملا تھا۔ چنانچہ مرکز کی طرف سے ایک نمائندہ اس میں شریک ہوا۔ یہاں لوگوں نے مسلم پرسنل لا کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ مرکز کے نمائندہ نے مسلم علماء کے نقطۂ نظر کی وکالت کی۔

4 سندھ نیشنل اکیڈمی حیدر آباد (پاکستان) نے صدر اسلامی مرکز کو لکھا تھا کہ صوبہ سندھ میں بڑھتے ہوئے الحاد کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ موصوف کی کتابوں کے ترجمے سندھی زبان میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے سندھی زبان میں شائع کیے ہیں۔ سندھی ترجمہ کے بعض نسخے مرکز میں موصول ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ اپنے خط (۲۹ دسمبر ۱۹۸۵) میں انھوں نے لکھا ہے کہ "پاکستانی معاشرہ کا اصلی بحران اخلاقی نوعیت کا ہے۔ یہاں رجوع الی اللہ کی بنیاد پر فکری اور علمی تحریک کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی کتابیں سب سے زیادہ موثر ہیں۔"

5 سعودی عرب کے اہل علم کا ایک وفد ہندستان آیا تھا۔ وہ چند دن دہلی میں ٹھہرا۔ اس موقع پر وفد کے ارکان ۴ جنوری ۱۹۸۶ کو صدر اسلامی مرکز سے ملنے کے لیے مرکز میں آئے۔ وفد کے افراد حسب ذیل تھے: دکتور محمد علی الہاشمی۔ دکتور احمد البرار الامیری۔ دکتور محمد حسن بریغش۔ دکتور حیدر الغدیر۔ استاذ احمد فہمی زمزم۔ اول الذکر چار افراد ریاض سے تعلق رکھتے تھے اور آخر الذکر انڈونیشیا کے باشندے تھے۔ ان حضرات نے تقریباً ایک گھنٹہ تک صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال

کیا۔ آنے والوں میں سے ایک صاحب نے بتایا کہ سعودی عرب سے اسلامی تنظیمات کی ایک دلیل (ڈائرکٹری) چھپی ہے اس میں اسلامی مرکز کا بھی تعارف ہے اور اس کی مطبوعات وغیرہ کا تذکرہ شامل ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ افریقہ کے مختلف ملکوں میں گیے تو وہاں انھوں نے دیکھا کہ صدر اسلامی مرکز کی کتابیں ہر جگہ موجود ہیں۔ اور اہل علم طبقہ ان سے استفادہ کرتا ہے۔

6 الرسالہ لوگوں میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے، اس کا اندازہ لوگوں کے تاثرات سے ہوتا ہے۔ ایک صاحب حیدرآباد سے لکھتے ہیں: الرسالہ تقریباً ایک سال سے پابندی کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔ الرسالہ کا ایک مضمون حیدرآباد کے روزنامہ سیاست میں چھپا تھا۔ اس کو دیکھ کر پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس وقت سے اب تک پابندی کے ساتھ الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ اس نے مجھے مثبت انداز فکر دیا۔ اور مجھ کو احساس محرومی سے نکالا۔ آہستہ آہستہ میرا جھوٹا فخر اور خوش فہمیاں بھی کم ہو رہی ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو اس کا احساس تک بھی نہ تھا۔ ایک بات کا مجھے کافی افسوس ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کاش الرسالہ مجھے اور پہلے ملا ہوتا (۹ جنوری ۱۹۸۶)

7 مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ۱۵۔ ۱۷ جنوری ۱۹۸۶ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع تھا:

Science Education in the Country with
Special Reference to Indian Muslims.

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو مذکورہ موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ موصوف نے اپنا مقالہ تیار کر لیا تھا۔ مگر آخر وقت میں بعض موانع پیش آنے کی وجہ سے صدر اسلامی مرکز سفر نہ کر سکے۔ ان کا مقالہ کانفرنس کے ذمہ داروں کو روانہ کر دیا گیا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا۔ انشاء اللہ اس کو الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبد السلام نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔

8 بنگلور میں خدا کے فضل سے اسلامی مرکز کی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ پتہ یہ ہے:

No. 3, Opp. Vasantha Soapnut, K.G. Hally, Bangalore 45

9 اردو اکیڈمی کی طرف سے دہلی میں ۸۔۱۰ فروری ۱۹۸۶ کو ایک کل ہند سیمینار ہوا۔ اس موقع پر اکیڈمی کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا: ——————
"اردو صحافت اور اخلاقیات" یہ مقالہ آئندہ انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

اسلامی مرکز کا لٹریچر جن لوگوں تک پہونچا ہے وہ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی تعارف کے لیے یہی سب سے زیادہ موثر لٹریچر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابیں زیادہ تر قومی اسلام کی ترجمانی کرتی ہیں نہ کہ حقیقۃً اصولی اسلام کی۔ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں کے تاثرات تقریباً ہر روز دفتر میں موصول ہو رہے ہیں۔ یہاں جناب پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ، بھوپال کا ایک خط (۴ دسمبر ۱۹۸۵) انھیں کے اپنے لفظوں میں بجنسہٖ نقل کیا جا رہا ہے۔ جناب گپتا صاحب الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ نیز انھوں نے مرکز کی متعدد مطبوعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

جناب بھائی مولانا وحید الدین صاحب، السلام علیکم۔

الرسالہ آپ کی دوری کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ امریکہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ خدا آپ کا سفر کامیاب کرے۔ میں نے حضورؐ کی سیرت پر دو کتابیں پڑھی۔ پہلی کتاب کا نام پیغمبر انقلاب اور دوسری کا نام دی آئیڈیل پروفٹ ہے۔ پہلی کتاب کے لیکھک آپ ہیں اور دوسری کے لیکھک مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ جس نے دھرم کو آگے رکھا اور خود اس کے پیچھے چلا ایسا انسان کبھی بھٹکتا نہیں۔ جب انسان نے اپنے کو دھرم سے آگے رکھا وہ بھٹک گیا۔ پیغمبر انقلاب میں آپ نے قرآن کی آیت تحریر کی ہے یا پھر حدیث کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ہی آپ کی قلم آگے بڑھ سکی ہے۔ جو آپ کی قلم نے لکھا وہ دھرم کی نمائندہ سیرت ہے۔ جیسے تنگ خیال ساہتکاروں نے قوم کی نمائندہ بنا رکھا تھا۔ جب کہ حضورؐ کی اصل سیرت قرآن اور حدیث ہے۔ جو کتھنی اور کرنی میں کھرا اترے وہ نبی ہے۔ آپ کی کتاب کے نبی جن جن اور گھر گھر کے نبی ہیں۔ دی آئیڈیل پروفٹ (خطبات مدراس کا انگریزی ترجمہ) میں لیکھک نے ویکتی گت خوبیوں کو سامنے رکھ کر قومی بڑائی کو اپنا مقصد بنایا ہے۔ اس کی نظر میں قومی کتاب کا لکھا جانا اولین اور سیرت کا لکھا جانا دوئم نظریہ رہا۔ جہاں دھرم دوسرا نظریہ بن جائے وہیں انسان راہ سے بے راہ اور گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں نبی جن جن اور گھر گھر کے نہ ہوتے ہوئے ایک خاص قوم کے نبی ہو گیے۔ دوسرے مذہبوں میں جو ہیرو ورشپ پائی جاتی ہے ایسا سب کچھ اس (کتاب) میں پایا۔ اس لیے ہیرو ورشپ کا نظریہ ہی دھرم کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے اور نفرت کا باعث ہے نہ کہ محبت کا۔ آپ کا خادم، پریم نارائن گپتا ایڈوکیٹ

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

March 1986
Number 112

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128

الرسالہ
کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

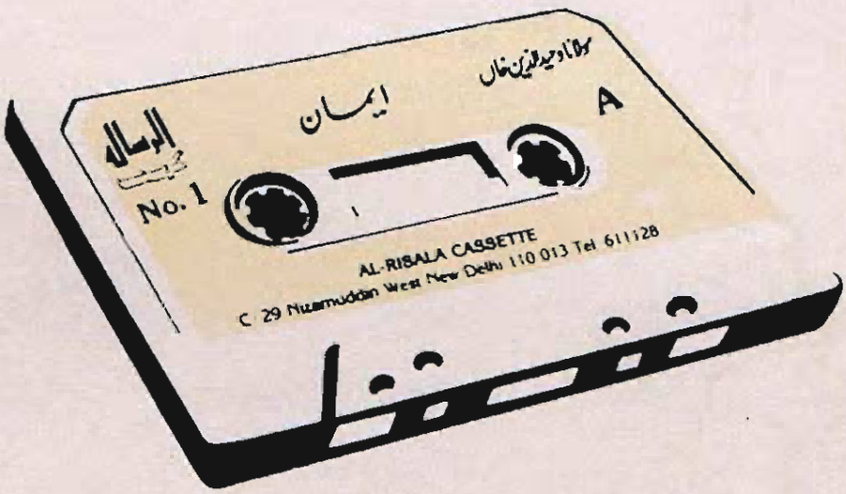

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحید الدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ — ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ — سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی — ۲۵ ڈالر امریکی — ۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں
الرسالہ کیسٹ
سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013